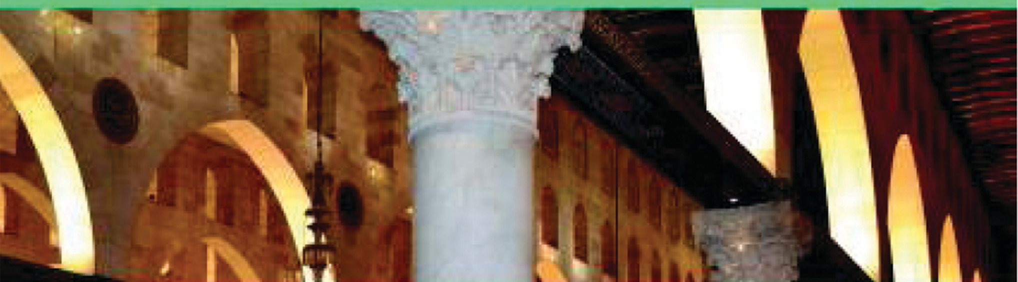
www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

September 2008 • No. 382



وقت کے استعمال کا بجٹ بنائیے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 250,
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

ستمبر 2008

فہرست

قبولیت کی شرط

کسی عملِ خیر کی قبولیت کی شرط کیا ہے، اِس کو قرآن کی سورہ نمبر 5 میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إنّما يتقبّل الله من المتقين (المائدة: 27) اللہ تو صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے:

God accepts only from the righteous (5:27)

متقی کے لفظی معنی ہیں: محتاط اور اندیشہ ناک۔ شرعی اصطلاح میں ایسے انسان کو خدا ترس کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کی تصویر اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: الّذين يُؤتون ما آتَوا وقلوبهم وجلة أنهم إلى ربّهم راجعون (المؤمنون: 60)، یعنی وہ لوگ جو دیتے ہیں، تو جو کچھ وہ دیتے ہیں، اِس طرح دیتے ہیں کہ اُن کے دل کانپ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جو شخص اِس معنیٰ میں متقی ہو، تو اس کا حال یہ ہوگا کہ جب وہ کوئی عملِ خیر کرے گا، تو وہ اُس کو احساسِ عمل کے تحت نہیں کرے گا، بلکہ احساسِ بے عملی کے تحت کرے گا۔ وہ اپنے عمل کو اتنا بے قیمت سمجھے گا کہ خدا اگر اس کو قبول کر لے، تو یہ خدا کا احسان ہے۔ اس کی سوچ یہ ہوگی کہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی آخری پیشی خدا کے یہاں ہونے والی ہے۔ یہ خدا ہے جو اگر اس کے عمل کو با قیمت قرار دے تو اس کا عمل با قیمت ہے، ورنہ اس کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف، وہ عملِ خیر کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف، اس کی آنکھ سے عجز کے آنسو نکل رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی احساسِ عجز ہے جو کسی عمل کو مقبول عمل بناتا ہے۔ جس عمل میں عجز کی روح شامل نہ ہو، وہ عمل کبھی مقبول عمل نہیں بنتا۔ خدا کے یہاں کمّیت (quality) کی اہمیت نہیں، بلکہ خدا کے یہاں کیفیت (quality) کی اہمیت ہے۔ خدا، بندے کے کسی عمل کو اس کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھے گا، بلکہ اِس اعتبار سے دیکھے گا کہ کرنے والے نے کس جذبے کے ساتھ وہ عمل کیا ہے۔

کفاف، تکاثر

رزق (livelihood) کا حصول ہر آدمی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اِس رزق کے لیے آدمی مختلف ذرائع سے مال کماتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اِس رزق کے دو معیار بتائے گئے ہیں۔ ایک ہے: کفاف (necessities)، اور دوسرا ہے: تکاثر (abundance)۔

قرآن کی سورہ نمبر 102 میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تکاثر کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں، یعنی زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مال ذریعۂ عیش نہیں، بلکہ وہ ایک سنگین ذمہ داری ہے، ایک ایسی ذمہ داری جس کے بارے میں خدا کی عدالت میں اُن سے پوچھا جائے گا۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس ہو، وہ مال کو اپنی زندگی میں ثانوی (secondary) درجہ دے گا، نہ کہ اولین (primary) درجہ۔ کیوں کہ وہ اِس حقیقت کو جانے گا کہ زیادہ مال کا مطلب ہے — زیادہ جواب دہی (more accountability)۔

دوسرا طریقہ کفاف کا طریقہ ہے۔ اِس کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قد أفلح مَن أسلم، ورُزق کَفافاً وقنّعه اللّٰه بما اٰتاه (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ؛ ابن ماجۃ، کتاب الزھد؛ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 168) یعنی وہ آدمی کامیاب رہا جس نے خدا کی اطاعت کی، اور اس کو بقدرِ ضرورت رزق ملا، اور اللہ نے اس کو جو کچھ دیا، اُس پر اس نے قناعت کیا۔

تکاثر کی نفسیات میں مبتلا ہونا دراصل مال کو اپنا سب کچھ سمجھنا ہے۔ ایسا آدمی رسمی طور پر خدا کا نام لے گا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے مال ہی کو اس کی زندگی میں معبود کا درجہ حاصل ہوگا۔ ایسا آدمی دنیا میں بظاہر مال دار دکھائی دے گا، لیکن آخرت میں وہ پوری طرح بے مال ہو جائے گا۔

اِس کے برعکس، جس شخص نے رزق کے معاملے میں کفاف کا طریقہ اختیار کیا، یعنی اُس نے بقدرِ ضرورت پر قناعت کی، وہ کامیاب انسان ہے۔ کیوں کہ ایسے آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی توانائی کو ضائع ہونے سے بچائے، وہ آخرت کی ابدی کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ عمل کرے۔

ضرورت، یا خواہش پرستی

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ من السَّرَف أن تأكل كلَّ ما اشتهيت (ابن ماجة، كتاب الأطعمة) یعنی یہ اسراف ہے کہ تم ہر وہ چیز کھاؤ جس کے کھانے کو تمھارا دل چاہے۔ یہی بات حضرت عمر فاروق نے اِن الفاظ میں کہی: كفىٰ بالمرء سرفاً أن يأكل كلَّ ما اشتهاه۔ یعنی آدمی کے مُسرف ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر وہ چیز کھائے جس کے کھانے کو اس کا دل چاہے۔

سرف اور اسراف کے لفظی معنیٰ — فضول خرچی (waste) کے ہیں، یعنی اپنے مال کو ایسی چیز میں خرچ کرنا جو آدمی کے لیے ضروری نہ ہو، وہ اس کی صرف ایک خواہش (desire) ہو، نہ کہ اس کی حقیقی ضرورت (need)۔

ہر آدمی دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے — ضرورت، اور خواہش۔ اپنے مال کو ضرورت کے بقدر خرچ کرنا، بلاشبہہ ایک جائز فعل ہے۔ لیکن خواہش کی تکمیل کے لیے اپنے مال کو خرچ کرنا، ایک ایسا فعل ہے جس کے لیے انسان کو آخرت کی عدالت میں جواب دینا پڑے گا۔

اِس معاملے میں مومنانہ طریقہ یہ ہے کہ جب بھی آدمی کے سامنے ایسا کوئی تقاضا پیش آئے جس میں مال کو خرچ کرنا ہو، تو وہ سنجیدگی کے ساتھ سوچے کہ یہ تقاضا اس کی حقیقی ضرورت کے لیے ہے، یا صرف اس کی خواہش کی بنا پر۔ اگر وہ تقاضا اس کی حقیقی ضرورت کی بنا پر ہو، تو وہ اس میں اپنا مال خرچ کرے۔ لیکن اگر اس کو محسوس ہو کہ یہ اس کی ضرورت کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اس کی خواہش کا معاملہ ہے، تو وہ فوراً اُس سے رک جائے اور ایسی کسی مد میں اپنا مال خرچ نہ کرے۔ اِس معاملے میں آدمی کو ہر دن اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر ایک دن کے لیے بھی اُس نے اس جائزے میں کوتاہی کی، تو اس کے بعد وہ اسراف کے ڈھلوان (slope) پر جا پڑے گا اور پھر اس پر پھسلتا ہی چلا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اس کی آخری حد پر پہنچ جائے۔ اس کے بعد درمیان میں رکنا، یا واپس لوٹنا، اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

معرفتِ حدیث، معرفتِ قرآن

قرآن اور حدیث کو سمجھنے کے لیے بلاشبہہ وہ علوم ضروری ہیں جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں، مگر اِن رواجی علوم کے علاوہ، ایک اور چیز ہے جو مدرسوں کے نصاب میں شامل نہیں، اور وہ ہے معرفت۔ قرآن میں اِس کو معرفتِ حق (المائدۃ: 83) کہا گیا ہے۔ یہ عارفانہ بصیرت اگر آدمی کے اندر نہ ہو، تو وہ مدارس کی سند حاصل کرنے کے باوجود، قرآن اور حدیث کو حقیقی طور پر نہیں سمجھ سکتا۔

اِس کی ایک مثال مستشرقین (orientalists) ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایسے مستشرقین پیدا ہوئے جو نصابی علوم کے ماہر تھے، جو عربی زبان اور فنّی علوم میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا، مگر وہ قرآن اور حدیث کو حقیقی طور پر سمجھنے میں ناکام رہے۔

حدیثِ رسول کے باب میں علماء، معرفتِ حدیث کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، مگر معرفتِ حدیث کے لفظ سے اُن کی مراد زیادہ تر اسناد، یا متن (text) کی معرفت ہوتی ہے، نہ کہ حقیقتِ حدیث کی معرفت۔ اسناد اور متن کی معرفت بلاشبہہ اہم ہے، لیکن اسناد اور متن کی معرفت صرف ایک فنی نوعیت کی معرفت ہے، نہ کہ حقیقی نوعیت کی معرفت۔

معرفت سے مراد وہی چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں، بصیرت (insight) کہا جاتا ہے، یعنی الفاظ کے حقیقی مصداق تک پہنچ جانا، سطور سے گزر کر بین السطور کو پڑھ لینا، کلام کے حقیقی مدعا کو سمجھ لینا۔ حدیث کے الفاظ میں، عبارت کے ظَہر (outer portion) اور بَطن (inner portion) دونوں سے واقف ہونا۔ اِسی کا نام معرفت ہے۔ اِس معرفت کے بغیر کوئی شخص حقیقی طور پر نہ قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور نہ حدیث کو۔ یہ معرفت، یا بصیرت دو چیزوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے— کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ دعا۔ کثرتِ مطالعہ سے کوئی آدمی ایک تیار ذہن (prepared mind) بنتا ہے۔ اور دعا کے ذریعے آدمی کی رسائی اُن پہلوؤں تک ہوجاتی ہے جو انسانی کتابوں میں مذکور نہیں۔ معرفت کے حصول کے لیے دونوں چیزیں یکساں طور پر ضروری ہیں۔

اخلاص اور بصیرت

دین میں اخلاص کی بھی اہمیت ہے، اور بصیرت کی بھی اہمیت۔ قرآن میں اخلاص کا معیار ابتغاء رضوان اللہ (الحدید: 27) بتایا گیا ہے، یعنی صرف اللہ کی رضا چاہنے کے لیے کام کرنا، کسی اور غرض کا اُس میں شامل نہ ہونا۔ بصیرت کی تعریف یہ ہے کہ آدمی حالاتِ زمانہ سے واقف ہو، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: أن یکون بصیراً بزمانه، یعنی مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر زمانی بصیرت پیدا کرے۔

اخلاص اور بصیرت دونوں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اُن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ اگر معاملہ صرف آدمی کی اپنی ذات سے ہو، تو اقدام کے لیے صرف اخلاص کافی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر معاملے کا تعلق اجتماعی احوال سے ہو، تو اخلاص کے ساتھ بصیرت بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ ایک آدمی اگر کامل اخلاص کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کسی شخص سے کرے اور وہ نکاح ناکام ہوجائے، تو اِس کا نقصان آدمی کو خود اٹھانا پڑتا ہے۔ اِس قسم کی غلطی سے کوئی عمومی فساد واقع نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی قابلِ معافی قرار پائے گا، اس کو قابلِ سزا قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن ایک رہ نما کے لیے یہ معیار کافی نہیں۔ کوئی رہ نما جب ایک تحریک چلاتا ہے، یا ایک عملی اقدام کرتا ہے تو اس کا تعلق ہزاروں انسانوں سے ہوتا ہے۔ اگر اس کی تحریک درست نہ ہو، یا اس کا اقدام ایک غلط اقدام ہو، تو ایسی صورت میں اس کی غلط تحریک، یا اس کے غلط اقدام کا نقصان پوری نسل کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جو شخص اجتماعی قیادت کے میدان میں داخل ہو، اس کے لیے صرف اخلاص کافی نہیں، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بصیرتِ زمانہ کا بھی حامل ہو۔ اگر وہ بصیرتِ زمانہ کا حامل نہیں ہے، تو اس کے لیے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کوئی اقدام نہ کرے۔ اس کی بے عملی کا کم سے کم یہ فائدہ ہوگا کہ لوگ اس کی غلط تحریک کے نقصان سے بچ جائیں گے۔ اگر آپ دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، تو کم از کم ان کو اپنے نقصان سے بچائیے۔ دوسروں کو اپنے نقصان سے بچانا بھی کرنے کا ایک کام ہے۔ اِسی عظیم حکمت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن لم تنفعه، فلا تضره۔

دعوتی کام، غیر دعوتی انداز

آج کل دعوت کا لفظ ایک فیشن بن گیا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو مختلف کاموں میں مشغول ہیں اور وہ ان کو دعوت کا نام دیے ہوئے ہیں، کچھ لوگ ملی ورک کررہے ہیں اور کچھ لوگ سوشل ورک، کچھ لوگ ڈبیٹ (مناظرہ) میں مشغول ہیں، اور کچھ لوگ کانفرنس اور سیمنار میں، کچھ لوگ کسی اور کام میں۔ یہ تمام لوگ اپنے کام کو دعوت کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا کام ایک خصوصی خدائی کام ہے۔ اُس کا اصول اور اس کا طریقہ دونوں، خدا نے اپنی کتاب (قرآن) میں تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔

دعوت کو قرآن میں دعوت الی اللہ (حٰمٓ السّجدة: 55) کہا گیا ہے، یعنی اللہ کی طرف بلانا۔ اللہ کی طرف بلانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کے تخلیقی پلان سے آگاہ کیا جائے۔ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اِس دنیا میں کسی انسان کے لیے صحیح زندگی یہ ہے کہ اس کی زندگی خدارخی زندگی (God-oriented life) ہو، وہ خودرخی زندگی (self-oriented life) یا کوئی اور رخی زندگی نہ ہو۔

اِس دعوتی کام کا طریقہ بھی متعین کردیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے الگ ہوکر اس کام کو کیا جائے۔ یہ دنیا چوں کہ دار الامتحان ہے، اِس لیے یہاں ہمیشہ لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسی حالت میں صحیح دعوتی طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی ایذاؤں پر یک طرفہ صبر (إبراهيم: 12) کرتے ہوئے دعوتی کام کو جاری رکھا جائے۔

دعوتی کام صرف ایک جذبے کے تحت ظہور میں آتا ہے، اور وہ ہے لوگوں کے لیے غیر مشروط خیر خواہی۔ ایک مومن جب زندگی کی حقیقت کو دریافت کرتا ہے، تو اس کے اندر بے پناہ طور پر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اِس حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ دوسروں کے لیے بھی یہ کوشش کرے کہ وہ جہنم سے بچ جائیں اور ان کو ابدی جنت میں داخلہ ملے۔ اِسی جذبے کے تحت ظاہر ہونے والے عمل کا نام دعوتی عمل ہے۔ ملّی ورک، یا سوشل ورک، دعوہ ورک نہیں۔ دعوہ ورک وہ ہے جو خدا کی نسبت سے کیا جائے، نہ کہ انسان کی نسبت سے۔

موت کا سبق

میں ایک جنازہ میں شریک ہوا۔ موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا۔ اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر وہ میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے، یہاں تک کہ قبر میں احترام کے ساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

''مٹی'' کے ساتھ ''انسان'' جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں۔ وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔ یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقرر دن میں کاغذ کا ایک انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لیے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

ایک انسان ہماری طرح ایک زندہ انسان تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم جواب دے گئے۔ بولتے بولتے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی، وہ سب اچانک ختم ہو گئی۔ اب خدا اِس واقعہ کو استعمال کرتا ہے، تاکہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ وہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلائے۔ لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: **منها خلقناكم** (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا تھا)، جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے: **وفيها نعيدكم** (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈال رہے ہیں) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: **ومنها نخرجكم تارةً أخرىٰ** (اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے)۔ یہ تین بار مٹی ڈالنا، اس پورے معاملہ کا کلائمکس ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

خدا کے حق کی قیمت پر

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اکثر خاندان کی تقریبات میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ الرسالہ مشن کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ میں نے اُن سے پوچھا تو اُنھوں نے کہا کہ رشتے داروں کا بھی تو حق ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کا حق، رشتے داروں کے حق سے بھی زیادہ ہے۔ آپ خدا کے حق کی قیمت پر رشتے داروں کا حق ادا کر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک جرم ہے، نہ کہ کوئی اچھا کام۔

موجودہ زمانے میں ہر عورت اور مرد کا یہی حال ہے، خواہ وہ بے دین ہو، یا بظاہر دین دار۔ ہر ایک اِس طرح فیملی کلچر میں پھنسا رہتا ہے، جیسے کہ اس کا خاندان ہی اس کا معبود ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی میں خدا کی حیثیت صرف ایک رسمی عقیدے کی ہوتی ہے۔ عملاً وہ اپنا وقت اور اپنا پیسہ اور اپنے جذباتِ محبت کا مرکز اپنے خاندان کو بنائے رہتے ہیں۔ اور رسمی الفاظ کی حیثیت سے خدا کا نام بھی لے لیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں رشتے داروں کے حقوق کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن اس کا تعلق حقیقی ضرورت سے ہے، نہ کہ خاندانی رسوم اور خاندانی رواج کو پورا کرنے سے۔ موجودہ زمانے میں ''رشتے داروں کے حقوق'' کے نام پر جو سرگرمیاں جاری ہیں، وہ بلاشبہہ ایک سنگین گناہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نمائشی قسم کی سرگرمیوں میں لگے رہتے ہیں اور بطور خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شرعی حقوق کو ادا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ جو کچھ کرتے ہیں، اگر وہ اس کو خاندان کے نام پر کریں، تو وہ صرف ایک گناہ ہے۔ اور اگر وہ اُس کو شریعت کے نام پر کریں، تو یہ گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے۔

یہ بے حد سنگین صورتِ حال ہے۔ کیوں کہ گناہ، خدا کے یہاں قابلِ معافی ہے، لیکن سرکشی خدا کے یہاں قابلِ معافی نہیں۔ جو آدمی سرکشی کی زندگی اختیار کرے اور توبہ کیے بغیر مر جائے، تو وہ اِس طرح خدا کی سخت پکڑ میں آ جائے گا کہ وہاں اُس کا کوئی رشتے دار اس کو بچانے کے لیے موجود نہ ہوگا۔

زندگی کے اُس پار

آدمی بظاہر ایک کامل وجود ہے۔ مگر حقیقت میں وہ صرف ایک ناقص وجود ہے۔ انسان کے پاس آنکھ ہے، مگر وہ خارجی روشنی کے بغیر دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کان ہے، مگر خارجی ہوا کے بغیر وہ سن نہیں سکتا۔ انسان کے پاس چلنے کے لیے پاؤں ہے، مگر زمین میں متوازن قوتِ کشش نہ ہو تو وہ چل نہیں سکتا۔ انسان کے پاس کھانے کے لیے منھ ہے، لیکن خارج میں غذا کا سامان نہ ہو تو وہ کھانے کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

اب ایک ایسے وقت کا تصور کیجیے، جب کہ آپ پوری طرح اپنے اِسی وجود کے ساتھ زندہ حالت میں ہوں، لیکن وہاں آپ کی ضرورت کے تمام خارجی سامان آپ سے چھن چکے ہوں۔ آپ کے پاس آنکھ ہو، مگر وہاں دیکھنے کے لیے خارجی روشنی موجود نہ ہو۔ آپ کے پاس منھ ہو، لیکن کھانے کی چیزیں وہاں سے غائب ہوچکی ہوں۔ آپ کے پاس پاؤں ہو، مگر وہاں متوازن کشش والی زمین آپ کے پاؤں کے نیچے موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہاں آپ اکیلے ہوگئے ہوں۔ آپ کے تمام اپنے لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ یہی صورتِ حال ہر عورت اور مرد کے ساتھ موت کے بعد پیش آنے والی ہے، اور موت ہر عورت اور مرد پر لازماً آنے والی ہے۔ کوئی بھی شخص جو آج زندہ ہے، وہ ضرور ایک دن مرے گا۔ اور پھر موت کے بعد وہ اپنے آپ کو جس دنیا میں پائے گا، وہ وہی دنیا ہوگی جس کا بیان اوپر کیا گیا۔

یہ آنے والا دن ہر ایک کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس آنے والے دن کو جانے اور اس کے لیے تیاری کرے۔ وہ دن جب آئے گا، تو وہ پوائنٹ آف نو رٹرن (point of no return) کی سطح پر آئے گا۔ اس کے بعد آدمی کو صرف بھگتنا ہوگا، نہ کہ پیچھے لوٹ کر دوبارہ تیاری کرنا۔ پیدائش کے بعد ہی ہر عورت اور مرد کا، کاؤنٹ ڈاؤن (countdown) شروع ہوجاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا یہ کاؤنٹ ڈاؤن کب اپنے آخری نمبر پر پہنچ جائے۔

دوڑ بے منزل

ہر آدمی بے تکان بول رہا ہے۔ ہر آدمی آخری حد تک اپنی ضرورتوں کو بڑھائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی لامحدود طور پر اپنی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ عیش اور راحت کی تمام چیزیں وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے اکھٹا کرلے۔ یہ مادّیت کی طرف مجنونانہ دوڑ ہے، مگر نتیجہ کیا نکل رہا ہے— ہر آدمی اِس احساس میں جیتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں۔ جوفُل فِل مینٹ وہ چاہتا تھا، وہ اس کو حاصل نہ کرسکا۔ ہر عورت اور مرد اِسی محرومی کے احساس میں جیتے ہیں۔ اِسی حال میں اُن کے رات اور دن گزرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی تمناؤں کا گھروندا حالات کے طوفان سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہے۔ اور اگر حالات اس کو نہ توڑیں تو موت ہر حال میں اپنے وقت پر آتی ہے اور ہر ایک کو مجبور کرتی ہے کہ وہ موت کے بے رحم فیصلے کو قبول کرے، جس طرح اس سے پہلے اِس دنیا میں آنے والے تمام لوگ موت کے فیصلے کو مجبورانہ طور پر قبول کر چکے ہیں۔

لوگ موت سے پہلے کی عارضی زندگی کا سامان درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل ضرورت یہ ہے کہ موت کے بعد کی ابدی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا جائے۔ موت سے پہلے کی زندگی، امتحان کی زندگی ہے۔ اِس بنا پر یہ خدا کی ذمے داری ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے وہ سامان فراہم کرے، جس کے ذریعے وہ اپنا امتحان دے سکے۔ مگر جہاں تک موت کے بعد کی زندگی کا معاملہ ہے، اس کی ذمے داری خدا نے نہیں لی ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں سارا معاملہ آدمی کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔

موجودہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ کچھ نہ کرو، تب بھی تم کو ضرورت کا سامان یک طرفہ طور پر فراہم کیا جائے گا۔ مگر اگلی زندگی کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ اگلی زندگی کا اصول ہے— جیسا بونا، ویسا کاٹنا۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ موجودہ زندگی کے لیے تو خوب دوڑ دھوپ کررہے ہیں، لیکن اگلی زندگی کے معاملے کو وہ سرتاسر بھولے ہوئے ہیں۔ موجودہ زندگی میں آج کی کمی، کل کے دن زیادہ عمل کرکے پوری کرلی جاتی ہے، لیکن اگلی زندگی میں کسی عورت اور مرد کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنے ماضی کی کمیوں کی دوبارہ تلافی کرسکے۔

شرک کی بے ثباتی

شرک کیا ہے۔ شرک یہ ہے کہ انسان، اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنائے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی انسان، اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتا ہے، تو وہ اپنے لیے نہایت بُرے بدل کا انتخاب کرتا ہے: بئس للظالمین بَدلا (الکھف: 50) یعنی یہ کتنا زیادہ بُرا بدل ہے ظالموں کے لیے:

How bad substitute they have chosen (18:50)

یہ آیت گویا کہ پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے۔ انسان نے بار بار ایسا کیا ہے کہ اُس نے خدا کے سوا، کسی اور کو اپنے لیے معبود کا درجہ دیا۔ لیکن ہر بار یہ ثابت ہوا کہ انسان کا انتخاب (choice) نہایت برا انتخاب تھا۔ ایک اللہ کے سوا، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کو اپنا معبود بنایا جائے۔

قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک انسان، نیچر کو معبود کا درجہ دیتا رہا۔ چناں چہ دنیا میں عمومی طور پر وہ نظامِ پرستش رائج ہوا جس کو فطرت پرستی (nature worship) کہا جاتا ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ، دریا، سمندر اور دوسری چیزوں کے بارے میں انسان نے یہ فرض کرلیا کہ اُن کے اندر اُلوہیت (divinity) موجود ہے۔ اِس مفروضہ کی بنا پر، نیچر کی ہر چیز انسان کے لیے قابلِ پرستش بن گئی۔

جدید سائنس کے زمانے میں نیچر کی ہر چیز کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا، ہر چیز کا آزادانہ مطالعہ کیا جانے لگا۔ اِس تحقیق سے معلوم ہوا کہ نیچر صرف نیچر ہے، اُس میں کسی بھی قسم کی الوہیت (divinity) موجود نہیں۔ اِس دریافت کے بعد فطرت پرستی (nature worship) کا افسانہ ختم ہوگیا۔ نیچر نے معبود ہونے کی حیثیت کو کھودیا۔

اِس کے بعد موجودہ زمانے میں صنعتی تہذیب (industrial civilization) کا دور شروع ہوا۔ اِس جدید تہذیب سے انسان کو بہت سی ایسی چیزیں ملیں، جو اُس کو پہلے نہیں ملی تھیں۔ جدید تہذیب کی اِس کامیابی نے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کردیا۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ جدید صنعتی تہذیب، اُن کے لیے معبود کا بدل (substitute) ہے۔ جدید تہذیب سے لوگوں کو وہی تعلق قائم ہوگیا

جو معبودِ حقیقی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ انسانی صنعت کا ایک بہت بڑا منفی پہلو ہے، وہ یہ کہ انسانی صنعت صرف تہذیب کو وجود میں نہیں لاتی، بلکہ وہ اِسی کے ساتھ صنعتی کثافت (industrial pollution) بھی پیدا کرتی ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی میں یہ صنعتی کثافت اپنی اُس حد کو پہنچ گئی جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جدید صنعت ہمارے لیے جو دنیا بنا رہی ہے، وہ ایک پُر کثافت دنیا ہے، یعنی ایک ایسی دنیا جہاں انسان جیسی کسی مخلوق کے لیے رہنا ہی ممکن نہیں۔

انسان یہ سمجھتا تھا کہ صنعتی تہذیب اُس کے لیے اِسی دنیا کو جنت بنا دے گی، مگر معلوم ہوا کہ صنعتی تہذیب جو دنیا بنا رہی ہے، وہ اپنی آخری حد پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک صنعتی جہنم (industrial hell) کے سوا اور کچھ نہیں۔ اِس طرح، صنعتی تہذیب کا مفروضہ معبود بھی ایک باطل معبود ثابت ہوا۔

اب انسان نے ایک اور معبود تلاش کیا۔ یہ معبود انسان کی خود اپنی ذات، یا سیلف (self) ہے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ خود انسان کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس کو وہ اپنے باہر تلاش کر رہا ہے۔ اِس ذہن کے تحت، یہ فرض کرلیا گیا کہ انسانی وجود کا صرف ایک منفی پہلو ہے، اور وہ موت ہے۔ لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ جدید میڈیکل سائنس یہ مسئلہ حل کردے گی اور انسان ابدی طور پر اِس دنیا میں جینے کے قابل ہوجائے گا۔ مگر میڈیکل سائنس بے شمار تحقیقات کے باوجود اِس معاملے میں ناکام ہوگئی، جدید میڈیکل سائنس، انسان کو ابدی زندگی (longevity) کا فارمولا نہ بتا سکی۔ چناں چہ یہ نظریۂ معبودیت بھی بے بنیاد ثابت ہوکر ختم ہوگیا۔

اب انسانی علم اُس مقام پر پہنچا ہے، جہاں اس کے لیے صرف ایک انتخاب (choice) باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ حقیقت پسند بنے اور اللہ واحد کو اپنا معبود تسلیم کرکے اس کے آگے جھک جائے۔ اِسی حقیقت پسندانہ اعتراف میں انسان کی دنیوی کامیابی کا راز بھی ہے اور اِسی میں اس کی اُخروی کامیابی کا راز بھی۔

شکر ایک اعلیٰ عبادت

شکر کیا ہے۔ شکر اُس داخلی کیفیت کا نام ہے جو کسی نعمت کے گہرے احساس سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کو گریٹ فُل نیس (gratefulness) کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کے مشہور لغت لسان العرب کے مطابق، شکر احسان کی معرفت اور اس کے تذکرے کا نام ہے (**الشکر: عرفان الإحسان ونَشرُہ،** 4/423)۔ راغب الاصفہانی کی کتاب **المفردات فی غریب القرآن** میں بتایا گیا ہے کہ شکر کا مطلب ہے— نعمت کے بارے میں سوچنا اور اس کا اظہار کرنا (**الشکر: تصور النعمة وإظهارها،** صفحہ: 265)۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ شکر نام ہے— احسان کی معرفت کا اور اس کا چرچا کرنے کا (**الشکر: معرفة الإحسان والتحدُّث به،** 2/172)۔

نعمت کا اعتراف (acknowledgement) ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ اعتراف جب خدا کی نسبت سے ہو، تو اِسی کا نام شکر ہے۔ انسان کے اوپر خدا کی نعمتیں سب سے زیادہ ہیں، اِس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ خداوندِ ذوالجلال کا شکر ادا کرے۔ حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ نے اپنی ایک دعا میں فرمایا: **ربّ اجعلني لک شَکّاراً** (**التّرمذی، کتاب الدعوات؛ ابن ماجة، کتاب الدعاء؛ مسند احمد،** جلد1، صفحہ: 227) یعنی اے میرے رب، تو مجھ کو اپنا بہت زیادہ شکر کرنے والا بنا۔

قرآن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اے لوگو، خدا کے شکر گزار بندے بنو۔ انسان سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے، وہ یہی شکر ہے۔ شیطان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو شکر کے راستے سے ہٹا دے۔ آغازِ حیات میں اُس نے خدا کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں انسانوں کو بہکاؤں گا، یہاں تک کہ تو اُن میں سے اکثر لوگوں کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا: **ولا تجد أكثرهم شاكرين:**

And you will not find most of them grateful (7:17).

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا کے بندوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں

جوشکر کرنے والے ہیں: وقليل من عبادي الشكور (سبا: 13)۔ شکر کا مطلب اگر یہ ہو کہ آدمی زبان سے شکر کے الفاظ بولتا رہے، تو ایسے لوگ ہمیشہ بہت زیادہ رہے ہیں اور آج بھی وہ بہت زیادہ ہیں۔ ایسے لوگ بے شمار ہیں جو اپنی گفتگو کے دوران بار بار الحمدللہ، اللہ کا شکر ہے اور اللہ کا فضل ہے، جیسے الفاظ بولتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دنیا بظاہر شکر کرنے والوں سے بھری ہوئی ہے، پھر مذکورہ قرآنی بیان کا کیا مطلب ہے کہ لوگوں میں بہت کم ہیں جو شکر کرنے والے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ شکر کی دو قسمیں ہیں— لسانی شکر، اور قلبی شکر۔ لسانی شکر کو نارمل شکر، اور قلبی شکر کو تھِرلنگ (thrilling) شکر کہہ سکتے ہیں۔ خدا کی خدائی شان کے مطابق، شکر صرف وہ ہے جو تھرلنگ شکر ہو۔ نارمل شکر صرف ایک لِپ سروس (lip-service) ہے۔ اِس قسم کا شکر خدا کو مطلوب نہیں۔ اِسی کے ساتھ ضروری ہے کہ خدا کے لیے انسان کا شکر ایک اضافہ پذیر شکر ہو۔ جو شکر ایک حالت پر قائم ہوجائے، وہ ایک جامد شکر ہے، اور جامد شکر وہ شکر نہیں جو خدا کے نزدیک مطلوب شکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

تھرلنگ شکر صرف اُس شخص کو ملتا ہے جو خدا کے احسانات پر مسلسل غور کرتا رہے۔ انسان کے اوپر خدا کے احسانات لامحدود ہیں۔ اِس لیے جو آدمی اِس پہلو سے غور وفکر کرتا رہے، وہ ہر وقت ایک نئے خدائی احسان کو دریافت کرے گا، وہ ہر وقت ایک نئے سببِ شکر کا تجربہ کرے گا۔ اس کے یہ تجربات کبھی ختم نہ ہوں گے، اِس لیے اس کے اندر شکرِ خداوندی کا احساس بھی مسلسل طور پر زندہ رہے گا۔

میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے سوچا کہ انسان کی قوتِ سماعت بھی کیسی عجیب ہے کہ اس کے کان میں بے شمار قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ ہر آواز کو ممیّز (differentiate) کرکے اس کو الگ سے پہچان لیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک ہاتھ کو حرکت دی اور بات کرنے کے لیے رسیور کو اٹھایا۔ دوبارہ میں نے سوچا کہ میرے جسم میں بہت سے اعضا ہیں، لیکن میرے دماغ نے صرف ایک عضو (ہاتھ) کو متحرک کیا کہ وہ رسیور کو اٹھائے۔ اِس عمل میں آنکھ کا بھی ایک حصہ تھا، کیوں کہ اگر آنکھ اپنا عمل نہ کرتی تو مجھے یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ رسیور کہاں ہے۔

جب میں نے ٹیلی فون پر بات کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ٹیلی کے دوسری طرف جو آدمی ہے،

وہ انگریزی زبان میں بول رہا ہے۔ میں اس کی بات کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری مادری زبان اردو ہے، اور دوسرے شخص کی زبان انگریزی۔ میں کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہوں، جب کہ میں اس کو اردو الفاظ میں ڈھال لوں۔ میں نے سوچا کہ دماغ کیسی عجیب نعمت ہے۔ جو اپنے اندر یہ انوکھی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کو فی الفور (instantly) اردو میں ڈھال دے۔ اور اِس طرح متکلم کی بات کو بلا تاخیر میرے لیے قابلِ فہم بنادے۔

اِس طرح کی بہت سی باتیں اُس وقت میرے ذہن میں آتی رہیں۔ میں ایک طرف، دور کے ایک شخص سے ٹیلی فون پر بات کررہا تھا اور دوسری طرف، عین اُسی وقت میں خدا کے بارے میں تھرلنگ شکر کا تجربہ کررہا تھا۔ یہ تجربہ اتنا زیادہ شدید تھا، جیسے کہ شکر کا ایک دریا میرے سینے میں جاری ہوگیا ہو۔ اِسی طرح ہر لمحہ انسان کو ایسے تجربات پیش آتے ہیں جن کے اندر شکر کا سمندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اِس اعلیٰ شکر تک آپ کی رسائی صرف غور وفکر کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچ ہی اعلیٰ شکر کا دروازہ ہے۔ جس آدمی کے اندر سوچ نہ ہو، اس کے اندر شکر بھی نہ ہوگا۔ ایسا آدمی ہر چیز کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہے گا۔ وہ شکر کے سمندر کے درمیان رہتے ہوئے بھی تھرلنگ شکر کا تجربہ نہیں کرے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ — اُن کے پاس آنکھ ہے، مگر وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہے، مگر وہ سنتے نہیں، ان کے پاس دماغ ہے، مگر وہ سوچتے نہیں۔ بظاہر وہ انسان نظر آتے ہیں، مگر وہ حیوان ہیں، بلکہ حیوان سے بھی زیادہ بدتر (الأعراف: 197)۔

اصل یہ ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک، اس کا ابتدائی اور ظاہری پہلو۔ اور دوسرا، اس کا زیادہ گہرا پہلو۔ چیزوں کا ظاہری پہلو ہر آدمی کو کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا جو گہرا پہلو ہے، وہ صرف سوچنے کے بعد کسی کو سمجھ میں آتا ہے۔ اعلیٰ شکر کا تجربہ کرنے کے لیے آدمی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ چیزوں کے گہرے پہلو پر غور کرے، تاکہ وہ ایک معمولی چیز کو غیر معمولی روپ میں دیکھ سکے:

It is the result of taking an ordinary thing, as an extraordinary thing.

ایک دن مجھے پیاس لگی۔ میرے سامنے میز پر شیشے کا ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا رکھا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کو دیکھ کر میرے دماغ میں ایک فکری طوفان برپا ہوگیا۔ اچانک ایک پوری تاریخ میرے ذہن میں آگئی۔ میری زبان سے نکلا کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تونے پانی جیسی نعمت انسان کو عطا کی۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں تھی۔ یہ ایک سپر شکر تھا، جس نے میری پوری شخصیت میں طوفان برپا کردیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کئی بلین سال پہلے ایسا ہوا کہ دو گیسوں، آکسیجن اور ہائڈروجن، کے ملنے سے پانی جیسی سیّال چیز بنی۔ یہ پانی گہرے سمندروں میں ذخیرہ ہوگیا۔ اِس کے بعد خدا نے تحفّظاتی مادّہ (preservative) کے طور پر اِس میں دس فی صد نمک ملا دیا۔ یہ پانی براہِ راست طور پر انسان کے لیے نا قابلِ استعمال تھا۔ اِس کے بعد خدا نے ایک عالمی نظام کے تحت، پانی کو نمک سے الگ کرنے کے لیے، اِزالۂ نمک (desalination) کا ایک آفاقی عمل جاری کیا۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ سمندروں کا کھاری پانی، میٹھا پانی بن کر بارش کی صورت میں ہم کو حاصل ہوگیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تھرلنگ شکر کی توفیق کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اِس کا واحد ذریعہ سوچ ہے۔ یہ دراصل سوچ ہے جو آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ سپر شکر کا ہدیہ اپنے رب کے حضور پیش کرے۔ سوچ کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں ہے جو آدمی کو اُس اعلیٰ شکر کا تجربہ کرائے جو کہ خدا کو انسان سے مطلوب ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: **ربّ اجْعلنی لک شکّاراً**۔ کوئی انسان، شکّار یا بہت زیادہ شکر کرنے والا کیسے بنتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی شکر کے کلمہ کو ہزاروں بار دہرائے، یا اور کوئی وظیفہ پڑھے۔ اِس کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ غور وفکر ہے۔ مذکورہ دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا، تو مجھ کو ربّانی غور وفکر کی توفیق دے، تاکہ میرے اندر اعلیٰ شکر کی کیفیات پیدا ہوں، جو کہ حقیقی معنوں میں کسی انسان کو خدا کا شکر گزار بندہ بناتی ہیں۔ آپ قرآن کا مطالعہ کریں، تو آپ پائیں گے کہ قرآن میں شکر کو صبر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **إنّ فی ذلک لآیاتٍ لکلّ صَبَّار شکور (لقمان: 31)**

یعنی اِس میں نشانیاں ہیں ہراُس انسان کے لیے جو بہت زیادہ صبر کرنے والا اور بہت زیادہ شکر کرنے والا ہو۔ اِس قسم کی آیات پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی کے مطابق، اعلیٰ شکر کی توفیق صرف اُن لوگوں کوملتی ہے جو بہت زیادہ صبر کرتے ہوئے اِس دنیامیں رہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کومکمل آزادی دی گئی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اِس بنا پر یہاں مختلف قسم کی برائیاں (evils) پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صورتِ حال خدا کے قانون کی بنا پر ہے، انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ اِس معاملے میں انسان کو ایک ہی اختیار (option) حاصل ہے، وہ یہ کہ وہ صبر وبرداشت سے کام لے، تا کہ وہ دنیامیں نارمل طریقے سے رہ سکے۔

شکر ایک ایسا جذبہ ہے جو صرف ایک ایسے مائنڈ میں پیدا ہوتا ہے جو کامل طور پر مثبت (positive) ہو، کسی بھی قسم کا منفی فکر (negative thought) اس کے ذہن میں موجود نہ ہو۔ مثبت ذہن کا آدمی ہی خدا کی توفیق سے اعلیٰ شکر ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ صبر دراصل شکر کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا نہ کرے، وہ شکر جیسی اعلیٰ عبادت بھی انجام نہیں دے سکتا۔

پندرہ بلین سالہ منصوبہ

سائنٹفک اکاؤنٹ کے مطابق، تقریباً پندرہ بلین سال پہلے، خالق کے حکم سے خلا (space) میں ایک بڑا کاسمک بال وجود میں آیا۔ اِس میں وہ تمام اَجزا (particles) موجود تھے جو آج ہماری کائنات کا حصہ ہیں۔ خالق کے حکم سے اِس عظیم گولے میں ایک انفجار (explosion) ہوا۔ اِس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔

کاسمک بال میں انفجار کے بعد اُس کے تمام اجزا وسیع خلا میں پھیل گئے۔ اُس کے بعد خالق کے پلان کے مطابق، وہ مختلف صورتوں میں مجتمع ہونا شروع ہوگئے۔ اِن ذرات کے اجتماع سے ان گنت ستارے بنے، کہکشائیں بنیں، ڈارک میٹر بنا، سولر سسٹم بنا، اِس طرح بتدریج وہ پوری دنیا وجود میں آئی جس کو ہم کائنات (universe) کہتے ہیں۔

اِس کے بعد خالق نے سیارۂ زمین (planet earth) کو اپنے خصوصی پلان کو بروئے کار لانے کے لیے منتخب کیا۔ لمبی مدت کے عمل کے بعد، سیارۂ زمین ٹھنڈا ہوا۔ خالق کے حکم سے یہاں پانی بنا، بارشیں ہوئیں اور دریا اور سمندر وجود میں آئے۔ سیارۂ زمین کا تقریباً تین چوتھائی حصہ پانی سے بھر گیا۔ اُس کے بعد خالق کے منصوبے کے مطابق، سیارۂ زمین پر سبزہ اُگا اور زمین کی خشکی کا حصہ ہرے بھرے درختوں اور جنگلوں سے بھر گیا۔

اِس کے بعد زمین پر خالق کے خصوصی پلان کے مطابق، اس کا اگلا حصہ ظہور میں آیا، یعنی حیوانات کی دنیا وجود میں آئی۔ بے شمار قسم کے جانور، مچھلیاں، چڑیاں، چوپائے اور طرح طرح کی ذی حیات اشیاء سے زمین بھر گئی۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، اُس کا اگلا مرحلہ یہ تھا کہ یہاں انسان کو پیدا کرکے سیارۂ زمین پر اس کو بسایا جائے۔ چناں چہ انسانِ اوّل کے طور پر آدم اور ان کی بیوی حوا کو پیدا کیا گیا۔ پھر اُس پہلے جوڑے سے انسانی نسل چلی، یہاں تک کہ زمین کے مختلف حصوں میں انسان کی آبادیاں قائم ہوگئیں۔

اِس کے بعد خدا کے منصوبے کا ایک اور حصہ ظہور میں آیا۔ یہ پیغمبروں کا پیدا ہونا تھا۔ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے درمیان خالق نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ یہ تمام پیغمبر، انسان تھے۔ خالق نے ان کو خصوصی طور پر اِس لیے بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی قابلِ فہم (understandable) زبان میں یہ بتائیں کہ ان کے بارے میں خالق کا تخلیقی پلان (creation plan) کیا ہے۔

پیغمبروں کی آمد کا یہ سلسلہ لمبی مدت تک چلتا رہا۔ پہلے انسان، آدم خود بھی ایک پیغمبر تھے۔ اس کے بعد ہر نسل میں پیغمبر آتے رہے۔ مثلاً حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور آخر میں پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

پیغمبروں کے ذریعے خدا نے ہر نسل کے انسانوں کو بتایا کہ موجودہ دنیا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ انسان کی آبادکاری کی اصل اور ابدی جگہ تو جنت ہے۔ جنت ابدی بھی ہے اور ہر اعتبار سے آئڈیل بھی۔ مگر جنت میں داخلہ صرف انتخابی بنیاد (selective basis) پر ہوگا۔

موجودہ دنیا میں خالق کی طرف سے غیر مَرئی (invisible) ریکارڈنگ کا نظام عالمی پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اِس نظام کے تحت، ہر عورت اور ہر مرد کے قول وعمل کا مسلسل ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن سامنے آجائے گا۔ پھر لوگوں کے اعمال کے ریکارڈ کے مطابق، اُن افراد کو منتخب کیا جائے گا، جو اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کی کامل دنیا میں بسائے جانے کے اہل ثابت ہوں گے۔ بقیہ لوگوں کو چھانٹ کر اُنھیں کائنات کے کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ابدی طور پر محرومی اور حسرت کے عذاب کو بھگتتے رہیں۔

خالق نے چاہا کہ وہ کچھ منتخب لوگوں کو اپنے اِس خصوصی انعام سے نوازے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ہر قسم کی لذت اور مسرت کے ماحول میں ابدی طور پر آباد رہیں، اور اپنی ہستی کے کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کا تجربہ کریں۔ یہ خالق کی خصوصی طور پر دی ہوئی ایک انوکھی رحمت ہوگی جو صرف منتخب قسم کے کچھ خوش قسمت لوگوں کے حصے میں آئے گی۔

خالق نے چاہا کہ وہ چمتکار کے طور پر اِس دنیا کو پیدا نہ کرے، بلکہ وہ پوری طرح اسباب وعلل

کے ذریعے اُس کو وجود میں لائے۔ حضرت موسیٰ، خدا کے پیغمبر تھے۔ انھوں نے ایک لکڑی زمین پر ڈالی اور خدا کے حکم سے وہ ایک زندہ سانپ بن گئی۔ خدا چاہتا تو اِسی طرح پوری کائنات کو اچانک معجزاتی طور پر پیدا کردیتا۔ مگر ایسا کرنے کی صورت میں انسان کے اندر تخلیقیت (creativity) کا ارتقا نہ ہوتا، نہ سائنس بنتی اور نہ تہذیب وجود میں آتی۔ اِس لیے خالق نے کائنات کو ایک لمبے پراسس (process) کے روپ میں پیدا کیا، تاکہ انسان اپنی سوچ کو عمل میں لائے اور ذہنی ارتقا کے اعلیٰ درجے تک پہنچ سکے۔

یہ ایک لمبا منصوبہ تھا۔ چناں چہ اس کی تکمیل میں تقریباً 15 بلین سال گزر گئے۔ موجودہ گلوبل وارمنگ، خالق کی طرف سے اِس بات کا الارم ہے کہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ختم ہوچکا، یعنی افراد کے انتخاب کا مرحلہ۔ اب خالقِ کائنات غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا۔ وہ کامل انصاف کے مطابق، لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور تیاری کرکے اپنے آپ کو اِس قابل بنائے کہ قیامت کے بعد بننے والی اگلی دنیا میں وہ ابدی جنت میں جگہ پا سکے۔

ہر طرف بے خوفی

انسانوں میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جو یہ مانتے ہوں کہ ان کی زندگی بس موت پر ختم ہو جائے گی، موت کے بعد ان کو دوبارہ زندگی ملنے والی نہیں۔ لوگوں کی بھاری اکثریت تقریباً 99 فی صد یہ مانتی ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، موت کے بعد بھی زندگی ہے جو کہ ابدی طور پر باقی رہے گی۔

اِس عقیدے کے باوجود تقریباً تمام لوگ اگلے مرحلۂ حیات کے بارے میں بے خوف ہیں۔ بطور عقیدہ وہ اگلی زندگی کو مانتے ہیں، لیکن ان کی عملی زندگی میں اس کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بے خوفی اتنا زیادہ عام ہے کہ اِس میں بہت کم کوئی استثنا پایا جاسکتا ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ایک نے زندگی بعد موت کے تصور کے ساتھ بطورِ خود ایک اور عقیدہ اپنا رکھا ہے جو زندگی بعد موت کے تصور کو اُس کے لیے ایک ایسا تصور بنا دیتا ہے جس کی حیثیت ایک رسمی عقیدے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

یہودی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ، زندگی بعد موت کے تصور کو مانتے ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ یہودی قوم، خدا کی خاص قوم ہے (المائدۃ: 18)۔ وہ سب کے سب بہر حال موت کے بعد جنت میں جائیں گے۔ یقینی نجات کے اِس عقیدے نے یہودی لوگوں کو آخرت کے بارے میں بے خوف بنا دیا ہے۔

مسیحی مذہب کے ماننے والے لوگ بھی زندگی بعد موت کا عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ حضرت مسیح، مصلوب ہو کر اُن کے گناہوں کا کفّارہ بن چکے ہیں۔ اب ہر مسیحی کی نجات یقینی ہے۔ اِس عقیدے نے مسیحی لوگوں کو بھی آخرت کے بارے میں بے خوف بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ اُن لوگوں کا ہے جو ہندوازم، یا جین ازم، یا بدھ ازم کو مانتے ہیں۔ اِن لوگوں کا عقیدہ

بھی یہی ہے کہ موت، انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ موت کے بعد بھی انسانی زندگی باقی رہتی ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ یہ مذاہب مشترک طور پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان موت کے بعد بار بار اِسی دنیا میں جنم لیتا رہتا ہے، کبھی انسان کی صورت میں، اور کبھی کسی غیر انسان کی صورت میں۔ مگر اِس نئے جنم کے دوران انسان کا حافظہ پُر اسرار طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی انسان اگر اپنے پہلے جنم میں خوب صحت مند ہو اور وہ برائیاں کرے، تو اگلے جنم میں وہ ناقص الاعضا (disabled) انسان کی صورت میں پیدا ہوگا۔ مگر اُس انسان کو یہ یاد نہیں ہوگا کہ وہ اپنے پچھلے کرم کی وجہ سے اِس ناقص صورت میں پیدا ہوا۔ اِس عدم حافظہ کی بنا پر اس کے اندر نہ ندامت (repentance) پیدا ہوتی ہے اور نہ اُس کے اندر محاسبہ (introspection) کا جذبہ ابھرتا ہے۔ وہ بدستور بے خبری میں جیتا ہے اور بے خبری میں مر جاتا ہے۔

اِس معاملے میں ٹھیک یہی حال خود مسلمانوں کا بھی ہے۔ بظاہر تمام مسلمان، زندگی بعد موت کے تصور کو مانتے ہیں۔ وہ جنت اور جہنم پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان، آخرت کے بارے میں بے خوف ہیں، اُن کو اپنے لیے جہنم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اِس کا سبب دوبارہ یہی ہے کہ انھوں نے بطور خود ایسے فرضی عقیدے بنا لیے ہیں جس کے مطابق، اُنھیں اپنی نجاتِ آخرت بالکل یقینی دکھائی دیتی ہے۔

مثلاً تمام مسلمان، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک اسپیشل گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جو عورت یا مرد مسلم خاندان میں پیدا ہو جائے، اس کی جنت یقینی ہو جاتی ہے۔ یہ عقیدہ بلاشبہہ ایک خودساختہ عقیدہ ہے۔ اس کا قرآن اور حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر وہ اتنا زیادہ عام ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے دماغوں میں بسا ہوا ہے، خواہ وہ مسلمان عالم ہو یا غیر عالم، وہ امیر ہو یا غریب، وہ خواص کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا عوام کے طبقے سے، سب اِس کو ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کو برائی سے روکنے کے لیے ایک طاقت ور محرک کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب اِس عقیدے کے ساتھ مذکورہ قسم کے خودساختہ عقیدے شامل کر لیے جائیں تو اُس کے بعد دوسری زندگی کو ماننا عملاً ایسا ہی ہو جاتا ہے، جیسے کہ اس کو نہ ماننا۔

قیامت کے دروازے پر

25 جون 2008 کی صبح کو میں آل انڈیا ریڈیو سے خبریں سن رہا تھا۔ خبروں کے آخر میں حسب معمول کھیل کی کمنٹری آنے لگی۔ ومبلڈن (Wimbledon) سے رپورٹ دیتے ہوئے، رپورٹر نے کہا کہ — ندال (Rafael Nadal) زبردست جیت کے دروازے پر:

Nadal on the threshold of a landslide victory.

اِن الفاظ کو سُن کر میں نے سوچا کہ لوگ کتنی زیادہ بڑی بھول میں مبتلا ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عظیم کامیابی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ندال سمیت پوری انسانیت آج قیامت کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے:

Nadal as well as whole humanity is on the threshold of Doomsday.

قرآن کی سورہ نمبر 23 میں تمام انسانیت کو خطاب کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے فرمایا: تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے:

Do you think that we created you without any purpose,
and that you shall not be returned to Us. (23:115)

قرآن میں اِس طرح کی مختلف آیتیں ہیں جن میں خدا کا کری ایشن پلان (creation plan) بتایا گیا ہے۔ اِس کے مطابق، خدا نے ایک آئڈیل دنیا بنائی جس کو جنت (paradise) کہا گیا ہے۔ یہ آئڈیل دنیا ابدی ہے (البقرۃ: 25)۔ وہ خوف اور حُزن سے خالی ہے (فاطر: 34)۔ وہاں انسان کے لیے کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کا سامان موجود ہے (حٰمٓ السجدۃ: 31)۔

اِس کے بعد خدا نے سیارۂ زمین کو بنایا اور پھر یہاں انسانی نسل کو آباد کیا۔ خدا نے انسان کو آزادی (freedom) عطا کی اور زمین پر بقاءِ حیات کے تمام اسباب فراہم کیے، جن کے مجموعے کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، سیارۂ زمین کی حیثیت ایک سلیکشن گراؤنڈ (selection ground) کی ہے۔ خدا کے فرشتے یہاں

رات دن انسان کا ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ جولوگ اپنے اعلیٰ ریکارڈ کے مطابق، جنت کے مستحق ٹھیریں گے، اُن کو منتخب کر کے موت کے بعد کی ابدی زندگی میں جنت میں بسایا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ کے لیے خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں گے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اِس آیت میں کہی گئی ہے:

بڑا با برکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے:

Glory is to God in whose hand is the kingdom, and He has power over all things; who created death and life, so He may test you, which of you is best in action. He is the mighty, the Most Forgiving. (67: 1-2).

انسانِ اوّل (آدم) کے بعد بے شمار لوگ پیدا ہوکر زمین پر آباد ہوئے اور بدستور پیدا ہوکر آباد ہورہے ہیں، مگر خدا کو صرف وہ عورت اور مرد مطلوب ہیں جو اُس کے تخلیقی پلان کے مطابق، احسنُ العمل (best in deed) ثابت ہوں۔

خدا کے اِس تخلیقی پلان کے مطابق، انسان اگر چہ ابدی مخلوق (eternal being) کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے، لیکن سیارۂ زمین پر اس کو ابدی طور پر نہیں رہنا ہے، موجودہ سیارۂ زمین اس کی عارضی قیام گاہ ہے۔ اِسی عارضی مدت کے خاتمے کے دن کا نام قیامت (Doomsday) ہے۔

سیارۂ زمین پر خدا نے وہ تمام اسباب اکھٹا کیے جو مذکورہ تخلیقی پلان کے مقصد کی نسبت سے ضروری تھے۔ اِن اسباب کی حیثیت وہی ہے جو امتحان ہال (examination hall) میں موجود سامان کی ہوتی ہے۔ یہ سامان، امتحان کی ضرورت کے تحت، امتحان ہال میں اکھٹا کیے جاتے ہیں۔ امتحان کے ختم ہوتے ہی ان کی مطلوبیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ طالب علم کو یہ اسباب صرف امتحان کے سامان کے طور پر دیے جاتے ہیں، نہ کہ ذاتی انعام کے طور پر۔ اس لیے امتحان

کے ختم ہوتے ہی طالبِ علم سے یہ تمام اسباب چھن جاتے ہیں۔

اِس معاملے میں خدا کے تخلیقی پلان کا ایک اور پہلو وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر 8 میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **لیهلک مَن هلک عن بيّنة ويحيٰى من حيّ عن بينة** (الأنفال: 42) یعنی جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے، وہ حجت کے ساتھ زندہ رہے۔

اِس قانونِ الٰہی کا ایک پہلو وہ ہے جو قیامت سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت جب آئے گی تو وہ براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آئے گی، لیکن انسانی معاملات میں خدا اپنا فیصلہ پُراسرار بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ اِس طرح کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو پوری طرح معقول اور جائز (justified) معلوم ہو۔ حالات بتاتے ہیں کہ، قرآن کے الفاظ میں، آنے والی گھڑی بالکل قریب آچکی ہے، اور کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں (**النجّم**: 53:57-58)۔

اِس معاملے کی پہلی علامت وہ تھی جس کو پری فائنل وارننگ (pre-final warning) کہا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے ٹوٹنے کی صورت میں پیش آیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، 1917 میں سوویت روس قائم ہوا۔ اِس کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ اس کو غیر معمولی توسیع و ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ 1957 میں سوویت روس نے پہلا راکیٹ (Sputnik) خلا میں بھیجا، تو اس کو عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

لیکن سوویت یونین، یا کمیونسٹ ایمپائر کی آئڈیالوجی میں آغاز ہی سے ایک ایسی چیز شامل تھی جو خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی۔ خدا نے اپنے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو لازمی طور پر آزادیٔ انتخاب (freedom of choice) عطا کیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر ٹیسٹ (امتحان) ممکن نہیں۔ لیکن کمیونسٹ ایمپائر نے خود ساختہ نظریے کے تحت، اپنے علاقے میں مذہبی آزادی کا مکمل خاتمہ کردیا۔ کسی بھی قسم کی مذہبی سرگرمی اس کے اندر خلافِ قانون قرار پاگئی۔ حکومتی سطح پر اینٹی ریلیجس ڈپارٹمینٹ قائم ہوا۔ اس کا کام یہ تھا کہ کمیونسٹ ایمپائر کے اندر وہ ہر قسم کی مذہبی سرگرمی کو کچل کر ختم کردے۔

یہ بات واضح طور پر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی، اور اِس قسم کی کوئی چیز خدا کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جو خدا کے تخلیقی پلان کی منسوخی کے ہم معنیٰ ہو۔ چناں چہ سوویت یونین میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ 1991 میں سوویت یونین کا سیاسی محل تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر ختم ہوگیا۔ یہ گویا کہ مادّی تہذیب کے فائنل خاتمہ سے پہلے دیا جانے والا ایک خدائی انتباہ (divine warning) تھا۔ لیکن اِس کے بعد بھی انسان نے اِس واقعے سے سبق نہیں لیا۔ اِس کے بعد بھی اُس نے ایسی سرگرمیاں جاری رکھیں جو خدا کے تخلیقی پلان سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

خدا نے اپنے تخلیق پلان کے مطابق، انسان کے لیے دو نہایت اہم چیزوں کا انتظام کیا ہے— اِن میں سے ایک کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے کو مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے برسوں میں انسان نے اِن دونوں فطری نظاموں کو ناقابلِ تلافی حدتک تباہ کردیا ہے اور اِس طرح اُس نے اِس کا جواز (justification) کھو دیا ہے کہ اس کو سیارۂ زمین پر مزید باقی رکھا جائے۔ کیوں کہ انسان کو زمین کے فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا کام کرنا تھا، اس کو یہ رائٹ نہیں تھا کہ وہ زمین کے فطری نظام کو تباہ کرڈالے۔

لائف سپورٹ سسٹم

خدا نے جب سیارۂ زمین پر اِنسان کو بسایا، تو یہاں اُس نے وہ تمام مادّی سامان مہیا کیے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور بقا کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی اور غذا، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اِن انتظامات کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو اس کے خالق نے ایک محدود مدت کے لیے بسایا ہے، اِس لیے یہ انتظامات محدود پیمانے پر کیے گیے ہیں۔ اِن انتظامات کو لامحدود طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام، انسان کی فطری ضرورت (natural need) کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اب اگر انسان ایسا کرے کہ وہ ہوس پرستانہ تعیش (luxury) کے لیے لامحدود طور پر

اُن کو استعمال کرنے لگے، تو اِس سے فطرت کا نظام غیر متوازن ہوجائے گا اور وہ چیز پیدا ہوجائے گی جس کو قرآن میں فساد (الأعراف: 85) کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں عملاً ایسا ہی پیش آیا ہے۔ انسان نے اپنی لامحدود خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اور تعیّشات کا انبار اپنے گرد اکھٹا کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتیں قائم کیں۔ بڑی بڑی موٹر کاریں بنائیں، بے شمار قسم کے کنزیومر گڈس (consumer goods) تیار کیے، ہر چیز کو ائر کنڈیشنڈ کرنے کی کوشش کی، ہتھیار کی صنعت (armament industry) کو چلانے کے لیے بڑے بڑے اسلحہ ساز کارخانے قائم کیے، وغیرہ۔ اِس قسم کی چیزیں انسان کی ضرورت (need) نہ تھیں، وہ صرف اس کی ہوس (greed) کا تقاضا تھیں۔ اِس انتخابی دنیا میں خدا کا نظام ضرورت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، نہ کہ ہوس کی بنیاد پر۔ مگر اتباعِ ہویٰ (الکہف: 28) کی وجہ سے یہ توازن ٹوٹ گیا۔ اِس طرح انسان، فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ گیا۔ اِس کا بھیانک نتیجہ ائر پلوشن، واٹر پلوشن، نوائز پلوشن اور پلاسٹک پلوشن، وغیرہ کی صورت میں نکلا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں فساد فی الأرض (الأعراف: 85) کہا گیا ہے، یعنی فطرت میں قائم کردہ توازن (balance) کا ٹوٹ جانا۔ موجودہ زمانے میں یہ واقعہ بڑے پیمانے پر پیش آیا ہے۔ قدیم روایتی زمانے میں انسان، فطرت (nature) کو صرف بقدرِ ضرورت استعمال کرتا تھا۔ اِس لیے دنیا میں فطری توازن کا نظام بگڑنے نہیں پایا۔ موجودہ صنعتی تہذیب کے زمانے میں انسان کو جدید طاقتوں پر دست رس حاصل ہوگئی۔ اب اُس نے لامحدود طور پر فطرت (nature) کا استعمال شروع کردیا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کا توازن مختل ہو کر رہ گیا۔

انسان نے جو کارخانے بنائے، اُن میں ایسا ایندھن استعمال ہوتا تھا جس سے وہ سنگین مسئلہ پیدا ہوا جس کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری فضا، مضر گیسوں سے بھر گئی۔ سمندر، خالص پانی کی فراہمی کا ذریعہ تھے، لیکن صنعتی کثافتیں جوندیوں وغیرہ کے ذریعے بہہ کر سمندر میں پہنچیں، ان کے نتیجے میں یہ ناقابلِ حل مسئلہ پیدا ہوا کہ سمندروں میں پانی کا

عظیم ذخیرہ پچانوے فی صد تک خطرناک طور پر آلودگی کا شکار ہوکر رہ گیا۔ حالات کی شدت کے نتیجے میں صحت بخش کیڑے مکوڑے (insects) روزانہ بہت بڑی تعداد میں مرکر ختم ہورہے ہیں، جن کا کوئی بھی بدل فراہم کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

جدید صنعتوں ہی کے نتیجے میں وہ سپر پرابلم پیدا ہوا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ تمام دنیا کے سائنس داں متفقہ طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین کے اوپر لائف سپورٹ سسٹم میں جو خطرناک بگاڑ آیا ہے، وہ ناقابلِ اصلاح (irreversible) ہے۔ تمام سائنس داں جدید سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ بیس سال کے اندر حالات اتنے زیادہ خراب ہوجائیں گے کہ سیارۂ زمین، انسان جیسی کسی مخلوق کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) ہوجائے گا۔

موجودہ سیارۂ زمین، انسان کو بقدرِ ضرورت استعمال کے لیے دیا گیا تھا، لیکن انسان نے تجاوز کرکے زمین کو بقدرِ تعیّش استعمال کرنا چاہا۔ اِس کے نتیجے میں انسان نے زمین پر اتنا زیادہ بگاڑ پیدا کردیا کہ اُس نے زمین پر مزید رہنے کا جواز کھودیا۔ بظاہر اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے، جب کہ انسان کو زمین سے بے دخل کردیا جائے۔ اِسی بے دخلی کے دن کا دوسرا نام قیامت ہے۔

مارل سپورٹ سسٹم

خدا نے انسان کو فطرتِ صحیحہ (الروم: 30) پر پیدا کیا۔ اُس نے انسان کے اندر پیدائشی طور پر بُرائی اور بھلائی کی تمیز رکھ دی (الشمس: 8) پھر خدا نے انسان کے اندر ضمیر (conscience) رکھ دیا، جس کو قرآن میں نفسِ لوّامہ (القیامۃ: 2) کہا گیا ہے۔ یہ نفسِ لوامہ، ہر انسان کے لیے ایک داخلی گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو صحیح اور غلط کا علم دیتا رہتا ہے۔

یہ پورا نظام جو نفسیات کی سطح پر قائم کیا گیا ہے، وہ گویا کہ انسان کے لیے ایک قسم کا مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو درست رویّے پر قائم رکھے، وہ انسان کو اخلاقی بگاڑ کی طرف جانے سے روکتا رہے۔

موجودہ زمانے میں انسان نے یہ سنگین جرم کیا کہ اُس نے خدا کے قائم کردہ اِس مارل سپورٹ سسٹم کو

تباہ کردیا۔ مغربی تہذیب کے فروغ کے بعد ایسے نظریے وضع کئے گئے جنھوں نے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ نیچر کوئی چیز نہیں، سب کچھ صرف نرچر (nurture) پر منحصر ہے، یعنی یہ دراصل سماجی اثرات ہیں جو کسی انسان کی شخصیت کو بناتے ہیں۔ اِس فلسفیانہ اسکول کو عام طور پر بہیویرازم (Behaviourism) کہا جاتا ہے۔ اس نظریے نے لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ربانی فطرت (divine nature) کوئی حقیقی چیز نہیں، وہ صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے:

Behaviourism: The doctrine that valid data consists only of the observable and measurable in individual's responses, not valuing subjective or introspective accounts.

اِسی طرح وہ فلسفہ وضع کیا گیا جس کو اِفادی نظریہ (Utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے نے اِفادیت پسندی کو وہ جگہ دے دی جو فطرت کے نظام کے تحت، اخلاقی اقدار (moral values) کو حاصل تھی۔ ذاتی مفاد نے زندگی میں وہ حیثیت اختیار کرلی جو اِس سے پہلے اعلیٰ اصولی معیارات کو حاصل تھی۔ اِس نظریے کا خلاصہ اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

Utilitarianism: The doctrine that the greatest happiness of the greatest number should be the aim of all action. The doctrine that the worth, or value of anything is determined solely by its utility.

اِس نظریے نے ذاتی خوشی، یا ذاتی مفاد کو کسی شخص کی زندگی میں واحد قابلِ لحاظ چیز قرار دے دیا۔ اِس نظریے کے مطابق، جس چیز سے آدمی کو خوشی ملے اور جس میں اس کو اپنا مادّی فائدہ نظر آئے، وہ اس کو بلا تأمل اختیار کرسکتا ہے۔ اِس معاملے میں ضمیر، یا فطرت کی آواز کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس نظریے نے فطرت کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کو زندگی کے معاملات میں اضافی (relative) قرار دے دیا۔ اِس طرح، فطرت کا قائم کیا ہوا اخلاقی نظام عملاً غیر موثر ہوکر رہ گیا۔

اِسی طرح، مارل سپورٹ سسٹم کو غیر موثر بنانے میں سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنے نظریات کے ذریعے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ مطلق اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہیں۔ اُس نے بتایا کہ — نفسیاتی پیچیدگیاں ابتدائی دور کے جذباتی صدمات

کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وہ دبی ہوئی صنفی توانائی کا اظہار ہیں۔ فرائڈ نے اپنے اِس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کی تکنیک اور خواب کی صنفی تعبیر کا سہارا لیا، اس طرح اس نے بتایا کہ نفسیاتی مسائل، دبے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ بعد کی زندگی میں شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کم عمری سے صنفی تعلقات قائم کیے جائیں:

> ...Symptoms were caused by early trauma, and were expressions of repressed sexual energy. Devised 'free association' technique and dream interpretation discover repressed experiences. Emphasized importance of infantile sexuality in personality's develpment in later life.

مذکورہ قسم کے نظریات، انسان کے ہوس پرستانہ جذبات کے عین مطابق تھے۔ چناں چہ ان کو آج کی دنیا میں خوب پھیلاؤ حاصل ہوا۔ اِسی کے نتیجے میں اِباحیت پسند سوسائٹی (permissive society) بنی۔ اِسی کے نتیجے میں ''آج'' میں جینے کا نظریہ بنا، جس کو عام طور پر رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ (right here, right now) کہا جاتا ہے۔ اِسی کے نتیجے میں برہنگی (nudity) ماڈرن کلچر کا حصہ بن گئی۔ ڈوز اینڈ ڈونٹس (do's and don'ts) کا قدیم نظریہ، لوگوں کو بے معنی نظر آنے لگا۔ شراب اور سیکس جیسی چیزوں پر عائد رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ انسان کے مطالعے کے لیے حیوان کو معیار سمجھ لیا گیا۔ زندگی کا مقصد صرف یہ بن گیا کہ — کماؤ اور عیش کرو۔

پریس میں ایک واقعہ آیا ہے کہ مغربی دنیا کے ایک شخص نے سرجری کے ذریعے اپنی صنف تبدیل کی۔ وہ مرد کے بجائے عورت بن گیا۔ پھر اس نے مرد جوڑے سے تعلقات قائم کیے۔ اُس کو حمل قرار پایا۔ اِس معاملے کو فخر کے ساتھ بتاتے ہوئے، اُس نے کہا کہ — عورت ہونا، یا مرد ہونا، یہ ہمارے اپنے انتخاب کی بات ہے:

Sex is a matter of choice.

یہ قول موجودہ زمانے کے انسان کی ترجمانی کرتا ہے۔ موجودہ زمانے کے انسان کی یہ سوچ بن گئی ہے کہ تمام اخلاقی قدریں اضافی (relative) ہیں، نہ کہ حقیقی (real)۔ کسی نے اعلان کے ساتھ

اور کسی نے اعلان کے بغیر یہ مان لیا ہے کہ نیکی اور بدی کا اصول کوئی ابدی اصول نہیں، نیکی اور بدی ہمارے اپنے انتخاب کی چیزیں ہیں:

Virtue and sin both are matter of personal choice,
rather than a matter pertaining to good and bad.

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، خالق کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کا رول، انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہم تھا۔ وہ انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کی ایک داخلی ضمانت تھا۔ مارل سپورٹ سسٹم، خدا کے تخلیقی پلان کا ایک لازمی حصہ تھا، مگر انسان نے آزادی کے غلط استعمال کو اُس کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ خدا نے انسان کی زندگی میں مارل سپورٹ سسٹم کی صورت میں چیک اینڈ بیلنس (check and balance) کا نظام قائم کیا تھا، تاکہ انسان، خدا کے مطلوب معیار کے منمم (minimum) پر قائم رہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں انسان اِس منمم حد پر قائم نہ رہ سکا۔ اِس طرح، اس نے یہ جواز (justification) کھو دیا کہ اس کو موجودہ زمین پر مزید مدت کے لیے باقی رکھا جائے۔

اخلاقی برائی کی آخری صورت

قومِ لوط کا زمانہ چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ قوم بحرِ مُردار (Dead Sea) کے علاقہ میں رہتی تھی۔ پیغمبر کے انذار کے باوجود وہ لوگ خدا کی پکڑ سے بے خوف ہوگئے۔ وہ بڑے پیمانے پر اُسی اخلاقی برائی میں مبتلا ہوگئے جس کو ہم جنسی (Homosexuality) کہا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں یہ برائی صرف ایک اخلاقی برائی کی حیثیت رکھتی تھی، مگر آج یہ اخلاقی برائی ایک خوب صورت فلسفہ کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ دنیا بھر میں تیزی سے اس کا رواج بڑھ رہا ہے، حتیٰ کہ بعض ملکوں میں ہم جنسی کے نکاح کو ایک قانونی نکاح کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

نئی دہلی میں ہم جنس گروہ (gay community) بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اِس قسم کے تقریباً ایک ہزار افراد نے 29 جون 2008 کو دہلی کی سڑکوں پر اپنا ایک پُرفخر پریڈ (pride parade) نکالا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہم جنسی کو برا سمجھنا، یا اس کے خلاف قانون بنانا، یہ سوشل ڈس کری مینیشن (social discrimination) ہے، اس کو بند ہونا چاہیے۔ یہ رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار

ٹائمس آف انڈیا (30 جون، 2008) میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ چھپی ہے:

Gay pride out on capital's streets, p. 3.

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اِس مظاہرہ کے وقت لوگوں کی طرف سے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اِس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے شرم وحیا کو کھودیا ہے، اور سماج میں اخلاقی ضمیر کا خاتمہ ہوچکا ہے۔

یورپ اور امریکا اور کینڈا میں یہ موضوع کھلے ڈسکشن کا موضوع بن چکا ہے۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں اِس موضوع پر باقاعدہ رسرچ ہورہی ہے۔ رسرچ کرنے والے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جنسی کا رجحان خود نیچر کے اندر موجود ہے۔ اِس معاملے میں وہ بعض چڑیوں اور بعض کیڑوں (insects) کی مثال دیتے ہیں۔ اِن نام نہاد تحقیقات کے بارے میں کئی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے:

Biological exuberance: Animal Homosexuality and Natural Diversity, by Bruce Bagemihl (Published in 1999)

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (29 جون، 2008) میں اِس کی رپورٹ تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

Homosexuality: Nature or Nurture

یہ صرف ایک مغالطہ ہے، نہ کہ کوئی حقیقی رسرچ۔ انسان کے بارے میں سائنٹفک رسرچ وہ ہے جو خود انسان پر کی گئی ہو اور انسان کے حیاتیاتی نظام کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہو۔ مذکورہ رسرچ میں یہ کیا گیا ہے کہ بعض کیڑوں کا مطالعہ کیا گیا اور اِن کیڑوں کی بعض عادات معلوم کرکے ان کو انسان کے اوپر چسپاں کردیا گیا۔ یہ ایک قیاس مع الفارق ہے، اور اِس قسم کا قیاس سائنسی طور پر معتبر نہیں۔

چار ہزار سال پہلے قوم لوط ٹھیک اِسی عمل میں مبتلا ہوئی تھی۔ جب پیغمبرانہ اِنذار کے باوجود انھوں نے اپنی اس روش کو ترک نہیں کیا، تو اُن پر خدا کی طرف سے ہلاکت خیز عذاب بھیجا گیا۔ اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے اُس قوم کا خاتمہ ہوگیا۔ اب یہی عمل مزید اضافے کے ساتھ، ساری دنیا میں پھیل

گیاہے۔قومِ لوط کا بگاڑ صرف اخلاقی بگاڑ کے ہم معنی تھا، موجودہ زمانے میں یہ اخلاقی بُرائی فلسفیانہ جواز کے تحت کی جارہی ہے۔ اِس طرح، موجودہ زمانے کی برائی، قدیم زمانے کی برائی کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ شنیع حیثیت رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ قدیم زمانے میں یہ برائی زمین کے صرف ایک محدود رقبے میں پائی جاتی تھی، آج یہ برائی پورے کرۂ ارض میں پھیل گئی ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس کو حدیث میں، قربِ قیامت کے آخری دور کی علامت کے طور پر، اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ویبقیٰ شرار الناس، یتھارجون فیھا تھارُجَ الْحُمُر (صحیح مسلم، کتاب الفتن) یعنی اُس وقت صرف برے لوگ دنیا میں باقی رہیں گے جو گدھوں کی طرح بے حیائی کا فعل کریں گے۔

یہ صورتِ حال اپنے آپ میں اِس بات کا ایک اعلان ہے کہ خدا کی پکڑ کا وقت بالکل قریب آچکا ہے۔ قومِ لوط کے زمانے میں، خدا کا عذاب ایک محدود قیامت کے طور پر آیا تھا، جس کو قرآن میں عذابِ ادنیٰ (السجدۃ: 21) کہا گیا ہے۔ اب یہ عذاب عالمی قیامت کے طور پر آنے والا ہے، جس کو قرآن میں عذابِ اکبر (السجدۃ: 21) کہا گیا تھا۔ قومِ لوط نے محدود طور پر اپنے وجود کا جواز (justification) کھویا تھا، اب انسانیت نے عالمی سطح پر اپنے وجود کا جواز کھودیا ہے۔

حالات پکار رہے ہیں کہ کاؤنٹ ڈاؤن اب اپنی آخری گنتی تک پہنچ چکا۔ قیامت کا فرشتہ اب ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جاگنے والو، جاگو۔ دیکھنے والو، دیکھو۔ کان والو، سنو۔ دماغ والو، سوچو۔ آج کا دن تمھارے لیے آخری دن ہے۔ اگر آج تم اپنے اختیار سے ہوش میں نہ آئے تو کل تم کو مجبورانہ طور پر ہوش میں آنا پڑے گا۔ مگر کل ہوش میں آنا، کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

موجودہ دنیا، انسان کو نہ انعام کے طور پر ملی ہے اور نہ کسی استحقاق کے طور پر۔ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے، اور خدا نے یہ دنیا انسان کو صرف ایک مقصد کے تحت عطا کی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں کے حالات میں رکھ کر یہ دیکھا جائے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو مطلوب خدائی معیار پر پورا اترا، تاکہ اس کا انتخاب (selection) کرکے اُس کو ابدی طور پر جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے اور باقی لوگوں کو رد کرکے ان کو عالمی کوڑاخانے میں ڈال دیا جائے۔

آدم کی پیدائش کے بعد سے اب تک پورے سیارۂ زمین پر یہی عمل جاری رہا ہے۔ اِس دنیا میں انسان کی آبادکاری کا یہی واحد مقصد تھا، اِس کے سوا دوسرا کوئی مقصد نہیں جس کے لیے انسان کو اِس دنیا میں رہنے اور بسنے کا موقع دیا جائے۔

اب انسان کی تاریخ اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے، اور بظاہر حالات بتاتے ہیں کہ اب یہ مقصد آخری حد تک پورا ہوگیا ہے۔ اب انتخاب کا عمل اپنے نقطۂ انتہا (culmination) کو پہنچ چکا ہے۔ اب انتخاب کی اِس فہرست میں مزید کسی اضافے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

موجودہ زمانے میں جب فطرت کے خزانوں کا انکشاف ہوا، تو اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ انسان اور بھی زیادہ اضافے کے ساتھ خدا کا اعتراف کرے، انسان اور زیادہ خدا پرست بن کر خدا کی انتخابی فہرست میں نمایاں جگہ پائے، مگر نتیجہ برعکس صورت میں نکلا۔ انسان سرکشی کے راستے پر چل پڑا۔ اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے کے بجائے، وہ اپنے لیے خود اِسی دنیا میں راحت اور عیش کا محل تعمیر کرنے میں مصروف ہوگیا۔

آج کی دنیا میں لوگوں کی سوچ کیا ہے، اُس کا اگر خلاصہ کیا جائے، تو وہ صرف ایک ہے—— آج اور صرف آج (right here, right now) یعنی کل کو نظر انداز کرکے صرف آج میں جینا، اور آج کی دنیا میں خوشی اور راحت کی زندگی حاصل کرنا، کیوں کہ اس کے آگے کچھ اور نہیں۔ یہی آج کی دنیا میں ہر عورت اور مرد کا کلمہ ہے، خواہ اس نے لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہو، یا اس نے لفظوں میں اس کا اعلان نہ کیا ہو۔ اِس طرح، موجودہ زمانے میں پہلی بار میٹیریل ازم نے نظریاتی طور پر ایک مبرَّر میٹریل ازم (ideologically justified materialism) کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ بلاشبہہ بُرائی کا آخری درجہ ہے، اِس کے آگے برائی کا کوئی اور درجہ نہیں ہوسکتا۔

یہ صورتِ حال سرتا سر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے اب اِس کا حق کھو دیا ہے کہ اُس کو موجودہ زمین پر مزید بسنے اور آباد رہنے کا موقع دیا جائے۔ مسیح کے الفاظ میں—— کسان درانتی اٹھاتا ہے، کیوں کہ کاٹنے کا وقت آپہنچا۔

بیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں خدا کے اِس فیصلے کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، اور

اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ایسے آثار ظاہر ہونے لگے جو یہ بتاتے تھے کہ اب انسان کے لیے بالکل آخری وقت آ پہنچا ہے، اب اُس کو مزید مہلت ملنے والی نہیں۔ جون 2008 میں، جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، انسانی تاریخ کے خاتمہ کی یہ علامت ایک مسلّمہ سائنسی واقعہ کی حیثیت اختیار کرکے روزانہ کی ایک خبر بن چکی ہے۔ آپ ہر دن میڈیا میں اِس سے متعلق کوئی نہ کوئی خبر پا سکتے ہیں۔

یہاں اِس نوعیت کی ایک تازہ سائنسی خبر درج کی جاتی ہے۔ امریکا کے مشہور سائنسی ادارہ ناسا (NASA) کے ممتاز سائنس داں جیمس ہانسین (James Hansen) نے بیس سال پہلے سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا تھا۔ اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا ہے۔ اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ بتایا ہے کہ — حالات اتنے زیادہ خراب ہوچکے ہیں کہ دنیا کے لیے واحد امید یہ ہے کہ ذمے داروں کی طرف سے نہایت سخت قسم کے انقلابی اقدامات کیے جائیں۔ دنیا بہت پہلے، خطرے کی حد کو پار کرچکی ہے۔ ضرورت ہے کہ مضر گیسوں کو 1988 کی حد پر دوبارہ واپس لے جایا جائے۔ زمین کی فضا میں انسانی ساخت کے کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اگر مزید بیس سال تک یہ جاری رہے، تو سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔ انسان کا وجود ہی سرے سے مٹ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بالکل آخری موقع ہے:

NASA warming expert says this is the last chance

Washington: Exactly 20 years after warning America about global warming, a top NASA scientist said the situation has gotten so bad that the world's only hope is drastic action. James Hansen told Congress that the world has long passed the "dangerous level" for greenhouse gases in the atmosphere and needs to get back to 1988 levels. He said Earth's atmosphere can only stay this loaded with man-made carbon dioxide for a couple more decades without changes such as mass extinction, ecosystem collapse and dramatic sea level rises. "We're toast if we don't go on a very different path," Hansen, director of the Goddard Institute of Space Sciences

who is sometimes called the godfather of global warming science said. "This is the last chance". Hansen brought global warming home to the public in June 1988 during a US heat wave. Hansen said that in five to 10 years, the Arctic will be free of sea ice in the summer. (The Times of India, New Delhi, June 25, p. 38)

موجودہ زمانے میں جس چیز کو گلوبل وارمنگ (global warming) کہا جاتا ہے، وہ دراصل گلوبل وارننگ(global warning) ہے۔ یہ خالقِ کائنات کی طرف سے، اِس بات کا اعلان ہے کہ انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آپہنچا۔ جلد سے جلد جنت کی خدائی فہرست میں اپنا نام درج کرادو، کیوں کہ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ اِس کا موقع آخری طور پر ختم ہوجائے گا۔

حالات بتاتے ہیں کہ انسان موجودہ زمین پر اب اپنی مزید آبادکاری کا جواز (justification) کھو چکا ہے۔ اب خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، بہت جلد انسانی تاریخ کا اگلا دور شروع ہونے والا ہے، جب کہ منتخب لوگوں کو ابدی جنت میں بسا دیا جائے، اور بقیہ لوگوں کو رد (reject) کرکے اُنھیں حسرت کے صحرا میں ابدی طور پر ذلت اور محرومی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ کا فارمولا عام طور پر، قبل ازموت زندگی (pre-death period of life) کی تعمیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ''رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ'' کا فارمولا بعد ازموت زندگی (post-death period of life) کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے، یعنی ''رائٹ ہیر، رائٹ ناؤ'' کا مطلب مستقبل کی تیاری ہونا چاہیے، نہ کہ حال کا وقتی انجوائے مینٹ۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اب انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آچکا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور اپنے باقی ماندہ وقت کو اگلے مرحلۂ حیات(post-death period) کی تیاری میں لگادے۔ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ انسان کے پاس نہ کچھ کرنے کا وقت ہوگا اور نہ تلافیٔ مافات کے لیے پیچھے لوٹنے کا وقت۔

فطرت سے تعاون

ایک صاحب نے کہا کہ جب میں اپنے گھر جاتا ہوں، تو میری بیوی میرے خلاف کوئی نہ کوئی سخت لفظ بول دیتی ہیں۔ اِس پر مجھے غصہ آجاتا ہے اور میں بھی کچھ بول دیتا ہوں، اور پھر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوجاتا ہے۔ اِس طرح کے جھگڑے میرے گھر میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اِس مسئلے کا حل کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے اور وہ یک طرفہ صبر ہے، یعنی آپ کی بیوی آپ کے خلاف بولیں، تب بھی آپ اُن کے خلاف نہ بولیں۔ آپ ہر حال میں یک طرفہ خاموشی کا طریقہ اختیار کریں۔ انھوں نے کہا کہ ایسا کیوں۔ آخر میں ہی یک طرفہ طور پر کیوں چپ رہوں، اُنھیں بھی تو چپ رہنا چاہیے۔ یہ تو انصاف کی بات نہیں ہوئی۔

میں نے کہا کہ یہ انصاف کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ عملی حل کا ایک معاملہ ہے۔ عورت پیدائشی طور پر جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی بات سے، زیادہ اثر لے لیتی ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ہو جس کے اوپر وہ اپنے جذبات کو نکالے۔ یہ عورت کی ایک فطری ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں عورت کا شوہر ہی وہ قریبی شخص ہوتا ہے جس کے اوپر وہ اپنے جذبات کو نکالے اور اپنے آپ کو دوبارہ معتدل بنائے۔

ایسے موقع پر مرد کو چاہیے کہ وہ اس کو انا (ego) کا مسئلہ نہ بنائے، بلکہ وہ تعاون (co-operation) کے جذبے سے کام لے۔ ایسی صورتِ حال میں مرد اگر اعراض کا طریقہ اختیار کرے، تو گویا کہ اُس نے تعاون کا طریقہ اختیار کیا۔ مزید یہ کہ اس کا یہ تعاون صرف عورت کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ فطرت کے ساتھ ہوتا ہے۔ قانونِ فطرت کے تحت، عورت مجبور ہے کہ وہ اِس قسم کا جذباتی اظہار کرے۔ اِس لیے مرد جب ایسے موقع پر تعاون کا طریقہ اختیار کرتا ہے، تو وہ اس کے لیے عبادت کا ایک معاملہ ہوتا ہے، یعنی اس نے فطرت کے قائم کردہ نظام کو رضا مندی کے ساتھ قبول کیا۔ یہ بلاشبہہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر خدا کے یہاں اس کو انعام دیا جائے گا۔

فرق کو جانئے

مسٹر اے اور مسٹر بی کو کسی بات پر ایک دوسرے کے خلاف شکایت ہوگئی۔ اور پھر آپس میں بول چال بند ہوگئی۔ یہ صورتِ حال کئی سال تک جاری رہی۔ آخر کار مسٹر بی کو یہ احساس ہوا کہ ایسا ہونا ٹھیک نہیں۔ وہ چل کر مسٹر اے کے پاس پہنچے اور سلام کلام کے بعد اُن سے کہا کہ آیئے ہم لوگ اپنی شکایت کو ختم کردیں۔ اِس معاملے میں اگر میری غلطی تھی، تو میں بلا شرط آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ جو کچھ ہوا، اُس کو آپ بھی بھلا دیں اور میں بھی بھلا دوں۔ اِس طرح ہم لوگ دوبارہ اپنے تعلقات کو نارمل بنالیں۔

مسٹر بی کی بات سننے کے بعد مسٹر اے نے کہا کہ میں اِس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ہمارے پیغمبر نے کہا ہے کہ مومن ایک بل سے دوبار ڈسا نہیں جاتا (لایُلدغ المومن بجحر مرّتین)۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اب میں دوسری بار آپ کا تجربہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

مذکورہ گفتگو میں مسٹر اے نے حدیثِ رسول کا جو حوالہ دیا، وہ درست نہ تھا۔ یہ حدیث عام تعلقات کے بارے میں نہیں ہے، وہ ایسے عملی معاملات کے بارے میں ہے جس میں اعتماد کی بنا پر کوئی کام کیا جاتا ہے۔ مثلاً تجارتی شرکت، یا وعدہ کی بنیاد پر کوئی لین دین۔ اِس طرح کے معاملات میں اگر کوئی شخص ایک بار بے بھروسہ ثابت ہو، تو اُس سے دوسری بار معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

عام سماجی تعلقات کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ عام سماجی تعلقات کے بارے میں دوسری حدیث ہے، اِس میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک شخص کو کسی سے شکایت ہوجائے، تو اُس کے لیے تین دن سے زیادہ بات چیت بند کرنا جائز نہیں۔ اِس طرح کی صورت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ تین دن کے اندر اپنی شکایت کو بھلا دے، اور دوبارہ نارمل انداز میں ملنا جلنا شروع کردے۔

مذکورہ واقعہ میں مسٹر اے نے جو بات کہی، وہ فرق کو نہ جاننے کی بنا پر تھی۔ انھوں نے دو صورتِ حال کے فرق کو نہیں سمجھا اور غلط طور پر ایک حدیثِ رسول کو ایسے موقع کے لیے استعمال کیا جس سے اس کا کوئی تعلق (relevance) نہ تھا۔

لاڈ پیار کا فتنہ

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا معاملہ کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی ہر خواہش پوری کرتے رہتے ہیں۔ اِس قسم کا لاڈ پیار ایک عظیم فتنہ ہے۔ اِس لاڈ پیار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذہن میں محبت کا ایک فرضی معیار قائم ہو جاتا ہے۔

محبت کا یہ فرضی معیار ماں باپ کے سلوک کی بنا پر بنتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ آدمی کے ذہن میں اتنا زیادہ بیٹھ جاتا ہے کہ آدمی اِس پوزیشن میں نہیں رہتا کہ وہ اُس کے خلاف سوچے۔ وہ اِس فرضی معیار کو عین حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ اُس کے خلاف سوچنا، اُس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ آخرکار یہ ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف میرے ماں باپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، ماں باپ کے سوا، کوئی اِس دنیا میں مجھ سے محبت کرنے والا نہیں۔ محبت کا یہ معیار انسان کے لیے قاتل ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کے معاملے میں تو خوش فہمی کی حد تک اچھی رائے رکھنے والا بن جاتا ہے، اور دوسروں کے بارے میں غلط فہمی کی حد تک وہ بُرا خیال قائم کر لیتا ہے۔ وہ اپنے والدین کے معاملے میں بھی غیر حقیقت پسند ہوتا ہے، اور دوسروں کے معاملے میں بھی غیر حقیقت پسند۔

انسان اپنے بچپن کا تھوڑا سا حصہ گھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارتا ہے۔ اِس کے بعد وہ باہر کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، ایک ایسی دنیا جہاں چیلنج ہے، مسابقت (competition) ہے، جہاں بے رحم حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔

ایسی حالت میں اپنے بچوں کے ساتھ والدین کی بہترین خیر خواہی یہ ہے کہ وہ اُن کو باہر کی دنیا کا سامنا کرنے کے لیے تیار کریں۔ وہ اپنے بچوں کو زندگی کی حقیقتوں سے باخبر کریں۔ لاڈ پیار سے بچے کا جو ذہن بنتا ہے، وہ صرف اس کے گھر کے اندر کام آتا ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی لاڈ پیار کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر والوں سے محبت کرتے ہیں اور بقیہ تمام لوگوں کے لیے ان کے دل میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

بہتر مستقبل کی طرف

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک یونی ورسٹی سے فرسٹ کلاس کی ڈگری حاصل کی۔ اِس کے بعد اُن کو ایک اچھا جاب (job) ملا۔ وہ اِس جاب پر خوش تھے، لیکن کچھ عرصے بعد اپنے باس (boss) سے ان کا اختلاف ہوگیا۔ اختلاف زیادہ بڑھا، یہاں تک کہ ان کو اپنا جاب چھوڑنا پڑا۔ اِس کے بعد اُن سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بہت زیادہ مایوس اور پریشان تھے۔ میں نے اُن کو سمجھایا اور پھر اُن کی ڈائری پر یہ الفاظ لکھ دیے:

''کبھی مالی باغ کے ایک درخت کو اکھاڑتا ہے، صرف اِس لیے تاکہ وہ اُس درخت کو دوسرے زیادہ بہتر مقام پر لگادے، جہاں وہ زیادہ بہتر طور پر پھل پھول سکے'' (4 اکتوبر 1981)۔ اِس مشورے کے بعد انھوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی، یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ کامیاب ہوگئے۔

یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ یہ قانون خاموش زبان میں ہر چوبیس گھنٹے کے اندر انسان کو بتایا جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری دنیا میں ہر شام کے بعد دوبارہ صبح ہوتی ہے۔ ہر رات کے بعد دوبارہ دن کا اُجالا ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ یہ فطرت کی خاموش زبان ہے۔ اِس طرح، فطرت انسان کو بتاتی ہے کہ اِس دنیا میں ناکامی ہمیشہ ایک عارضی واقعہ ہوتا ہے۔ اِس دنیا میں ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی آتی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ اُس کا انتظار کرے۔

انتظار کا مطلب بے عملی نہیں ہے۔ انتظار کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی جدوجہد کو مسلسل طور پر جاری رکھے۔ وہ ہر ناکامی کو وقتی چیز سمجھے، اور مستقبل کے بارے میں اپنی امید کو کبھی ختم نہ ہونے دے۔ وہ پیچھے کی باتوں کو بھُلائے، اور ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا رہے۔ وہ جذباتی اقدام سے اپنے آپ کو بچائے، اور مبنی بَر حقیقت منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کرے۔ زندگی میں ہمیشہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی تجربات کی روشنی میں اپنے معاملے کا پھر سے اندازہ (re-assessment) کرے، وہ ازسرِ نو غور کرکے اپنے عمل کا نیا منصوبہ بنائے۔ یہی بہتر مستقبل کی طرف سفر کا واحد کارگر اصول ہے۔

سوال وجواب

سوال

میں ماہ نامہ الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ آپ کبھی کبھی ایسا کرتے ہیں کہ قرآن کی کوئی آیت نقل کرتے ہیں۔ اس آیت کے ساتھ سورہ کا نام اور آیت کا نمبر موجود ہوتا ہے، لیکن اس کا ترجمہ موجود نہیں ہوتا۔ میں عربی زبان نہیں جانتا، اِس لیے مجھ کو اس کا مطلب سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اگر آپ آیت کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی لکھ دیں، تو ہمارے جیسے لوگوں کے لیے بہت اچھا ہوگا (ایک قاری الرسالہ، بہار)۔

جواب

عام طور پر الرسالہ میں آیت کا ترجمہ دیا جاتا ہے، مگر کبھی کبھی ترجمہ موجود نہیں ہوتا۔ ایسا بالقصد کیا جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ الرسالہ کے قاری براہِ راست طور پر قرآن سے مربوط ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اِس زمانے میں چھپا ہوا با ترجمہ قرآن ہر گھر میں موجود رہتا ہے۔ اور اگر بالفرض کسی کے گھر میں با ترجمہ قرآن موجود نہ ہو تو اس کو پہلی فرصت میں با ترجمہ قرآن حاصل کرکے اپنے گھر میں رکھنا چاہیے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جب بھی الرسالہ کا قاری ایسی کسی آیت کو الرسالہ میں پڑھے تو وہ قرآن کھول کر حوالہ کے ذریعے مذکورہ آیت نکالے اور اس کو پڑھ کر اس آیت کا ترجمہ معلوم کرے۔ اس طرح اُس کے مطالعہ کا تاثر بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔

قرآن کی حیثیت زندگی کے معاملات میں ایک ریفرنس بک (reference book) کی ہے۔ پرنٹنگ پریس سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ اکثر مسلمان قرآن کے حافظ ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا، تو وہ اپنے حافظے کی مدد سے قرآن کی اس آیت تک پہنچ جاتے اور اُس سے اپنے لیے رہنمائی حاصل کرتے۔ اب پرنٹنگ پریس کا زمانہ ہے اور باترجمہ قرآن کے نسخے چھپے ہوئے ہر گھر میں موجود ہیں۔ اور بالفرض اگر کسی کے گھر میں باترجمہ قرآن موجود نہ ہو تو بہت آسانی کے ساتھ وہ اس کو قریبی مارکیٹ سے حاصل کرسکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ الرسالہ کا ہر قاری قرآن کو اپنے لیے ایک

ریفرنس بک بنالے۔ جب بھی قرآن کی کوئی آیت اس کے سامنے آئے تو خواہ وہاں اس کا ترجمہ موجود ہو یا موجود نہ ہو، ہر حال میں وہ اس آیت کو اپنے باترجمہ قرآن میں براہِ راست دیکھے۔ اِس طرح اس کا تعلق قرآن سے بڑھے گا اور اس کے یقین میں اضافہ ہوگا۔

آپ جانتے ہیں کہ الرسالہ محض ایک ماہ نامہ پرچہ نہیں، وہ ایک دینی تحریک ہے۔ الرسالہ کا مقصد یہ ہے کہ قرآنی خطوط پر لوگوں کی ذہنی تربیت کی جائے۔ یہ مقصد اس وقت پورا ہوتا ہے جب کہ آپ الرسالہ کو قرآن سے ملا کر پڑھیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی تفسیر تذکیر القرآن کا ایک نسخہ اپنے پاس رکھیں۔ آپ تذکیر القرآن کا مطالعہ الگ سے بھی کریں اور الرسالہ کو پڑھتے ہوئے بھی جہاں کوئی آیت آئے تو اس کو بھی تذکیر القرآن سے ملا کر دیکھیں۔ اس طرح آپ کے مطالعہ کی دینی افادیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

الرسالہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ وقت گزاری کے طور پر اس کو پڑھ لیا جائے۔ الرسالہ ایک تحریک ہے۔ الرسالہ کی اِس تحریکی نوعیت کا تقاضا ہے کہ اس کو باقاعدہ اور منظّم مطالعے کے انداز میں پڑھا جائے۔ الرسالہ کے مطالعے کو مکمل ذہنی سرگرمی کا ذریعہ بنا دیا جائے۔

مجھے کئی بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ ایک شخص مجھ سے ملے گا۔ وہ چند گھنٹے میرے ساتھ گزارے گا، پھر جاتے ہوئے وہ کہے گا کہ میں برسوں سے ماہ نامہ الرسالہ اور آپ کی کتابیں پڑھ رہا تھا اور اس سے متاثر تھا، لیکن چند گھنٹہ آپ کی صحبت میں بیٹھنے سے جو فائدہ ہوا، وہ برسوں تک الرسالہ اور کتابیں پڑھنے سے نہیں ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ ماہ نامہ الرسالہ کو صرف انٹرسٹ ریڈنگ (interest reading) کے لیے پڑھتے ہیں۔ اِس کا اندازہ اِس طرح ہوتا ہے کہ جب اُن سے پوچھا جائے کہ آپ الرسالہ کیوں پڑھتے ہیں، تو وہ کہیں گے کہ اُس میں نئی نئی معلومات ہوتی ہیں۔ اس کا اسلوب منفرد ہے۔ اِس میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالے جاتے ہیں، وغیرہ۔ جو لوگ اِس قسم کی بات کہتے ہیں، وہ ابھی تک صحیح معنوں میں الرسالہ کے قاری نہیں بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو صحبت سے جو چیز ملتی ہے، وہ ان کو الرسالہ کے مطالعے سے نہیں ملتی۔

الرسالہ کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو کئی بار پڑھا جائے۔ اگر ممکن ہو تو اس کے حوالوں کو دوبارہ اصل کتاب میں دیکھا جائے۔ الرسالہ کے مضامین پر علمی انداز میں باہم مذاکرہ کیا جائے۔ مزید غور وفکر کے ذریعے سطور کے درمیان اس کے بین السطور کو جاننے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اِس طرح الرسالہ کا مطالعہ کریں، ان کے لیے الرسالہ کا مطالعہ، ایک زندہ مطالعہ بن جائے گا۔ جو چیز انھوں نے ''صحبت'' کے ذریعے پائی تھی، وہ اس کو الرسالہ کے مطالعے کے دوران پالیں گے۔

سوال

میرے پاس 1986 سے الرسالہ کی ایجنسی ہے۔ میں الرسالہ مشن کا ایک خادم ہوں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے الرسالہ کا ہدیہ نہیں بڑھ رہا ہے، جب کہ کاغذ روز بروز اچھی کوالٹی میں آرہا ہے، پھر طلبا اور ٹیچر وغیرہ کو سالانہ 50 روپئے میں الرسالہ کس طرح دے رہے ہیں۔ اِسی طرح مطبوعاتِ الرسالہ، لائبریریوں اور مساجد کے لیے 50 فی صد سے زائد کمیشن پر کس طرح سے دے رہے ہیں۔ یہاں بعض لوگ اِس سلسلے میں طرح طرح کے اشکالات اٹھا رہے ہیں (ایک قاری الرسالہ، مہاراشٹر)۔

جواب

جو سوال آپ نے نقل کیا ہے، وہ کوئی سوال نہیں۔ یہ صرف غیر سنجیدہ ذہن سے نکلی ہوئی ایک بات ہے۔ الرسالہ کی قیمت کم کرنے کے بجائے، اگر ایسا کیا جاتا کہ اس کا زرِتعاون بڑھا دیا جاتا، تب بھی غیر سنجیدہ لوگ چپ نہیں ہوسکتے تھے۔ اب وہ کہتے کہ دیکھو، الرسالہ والے دین کو تجارت بنا رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ الرسالہ، لوگوں میں بہت مقبول ہو رہا ہے تو انھوں نے اس کا زرِتعاون بڑھا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غیر سنجیدہ انسان کو کسی بھی دلیل سے چپ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر دلیل کے بعد وہ کچھ ایسے الفاظ پالے گا جس کو بول کر وہ بطور خود مطمئن ہوجائے، اور سچائی کا اعتراف نہ کرے۔ ایسے لوگوں سے الجھنے کے بجائے، ان سے اعراض کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

1- الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کا ایک تربیتی اجتماع 24 مئی 2008 کو گُڑگاؤں میں ہوا۔ یہ ایک دن کا اجتماع تھا۔ اِس موقع پر شرکاء نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ یہاں صدر اسلامی مرکز کی تین تقریریں ہوئیں۔ اِن تقریروں میں دعوت اور تربیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی۔ اجتماع کی کچھ کارروائی ''کپور ہاؤس'' میں ہوئی اور کچھ کارروائی وہاں کے ایک کھلے پارک میں۔ اِس پوری کارروائی کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی ہوئی۔ یہ پورا پروگرام نیچر کے ماحول میں ہوا۔ اِس تربیتی اجتماع میں شریک ہوکر لوگوں نے اپنے دعوتی اور ربّانی شعور میں اضافہ محسوس کیا۔

2- 30 مئی 2008 کی شام کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (لودھی روڈ، نئی دہلی) میں ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام سی پی ایس انٹرنیشنل اور گڈورڈ بکس کی طرف سے کیا گیا۔ اِس پروگرام کے تحت، صدر اسلامی مرکز کا خطاب تھا۔ تقریر کا عنوان یہ تھا:

Global warming and Islam

اِس عنوان کے تحت، صدر اسلامی مرکز نے ایک گھنٹہ تقریر کی۔ انھوں نے قرآن اور حدیث اور جدید سائنسی تحقیقات کی رشنی میں بتایا کہ گلوبل وارمنگ دراصل گلوبل وارننگ ہے۔ یہ خاتمۂ تاریخ کا آغاز ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈریں اور خدائی نقشے کے مطابق، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب ہوا۔ لوگوں نے اِس پروگرام کو بہت پسند کیا۔ حاضرین کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات پر مشتمل تھی۔ انھوں نے کامل سنجیدگی کے ساتھ پروگرام کو سنا اور اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا۔ تقریر کے بعد انگریزی میں چھپا ہوا دعوتی لٹریچر ان کے درمیان تقسیم کیا گیا۔

3- سائی انٹرنیشنل سینٹر (لودھی روڈ، نئی دہلی) میں 11 جون 2008 کو حسب معمول ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام مختلف نوودیہ ودیالیہ کے پرنسپل حضرات کی ٹریننگ کے لیے تھا۔ اِس کا عنوان یہ تھا:

Basic Human Values in Islam.

اِس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اِس میں شرکت کی۔ اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں موضوع کی وضاحت کی۔ ایک گھنٹے کی تقریر کے بعد آدھ گھنٹے کا سوال وجواب ہوا۔ اِس موقع پر سی پی ایس انٹرنیشنل کی ٹیم کے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے حاضرین کے درمیان انگریزی میں چھپا ہوا خوب صورت لٹریچر تقسیم کیا۔ لوگوں نے اس کو بہت شوق سے لیا اور اپنی دل چسپی کا اظہار کیا۔

4- امریکن ٹی وی کمپنی ونڈر لینڈ انٹرٹین مینٹ (Wonderland Entertainment) کی ٹیم نے یکم جولائی 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویور مسٹر امینول (Emananuel Itier) تھے۔ سوالات خاص طور پر دو موضوع سے متعلق تھے— اسلام میں پیس کی اہمیت، اسلام میں اِسپریچویلٹی کا تصور۔ دونوں موضوعات پر انھیں اسلام کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔ انٹرویو کے آخر میں ان کو انگریزی میں چھپی ہوئی کچھ اسلامی کتابیں دی گئیں۔ مثلاً گاڈ ارائزز، آئڈیالوجی آف پیس، وغیرہ۔

5- یکم جولائی 2008 کونئی دہلی کے فوکس ٹی وی (Focus TV) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو رکا نام روچپا گھوش تھا۔ ان کے سوالات کے دوران اُنھیں پردہ کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بتائی گئیں۔ انٹرویو کے آخر میں ان کو کچھ اسلامی پمفلٹ مطالعے کے لیے دیے گئے۔

6- برادرِ محترم مولانا محمد ذکوان ندوی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

5 مئی 2008 کو میرا دہلی کا سفر ہوا تھا اور آپ کی معرفت مولانا وحید الدین خاں صاحب سے ملاقات اور گفت وشنید کا موقع نصیب ہوا تھا۔ یوں تو میں الرسالہ کا قدیم قاری ہوں۔ مولانا کی تحریر سے میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ ان کے مزاج میں تواضع اور انکساری کا جذبہ موجود ہوگا، مگر مولانا سے ملنے کے بعد میرے اِس احساس میں حد درجہ اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ چیز جب میں نے جامعہ اسلامیہ عبد اللہ پور کے سابق پرنسپل مولانا منظور الرحمٰن قاسمی (90 سال) سے بیان کی تو وہ رو پڑے اور فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تحریروں میں جو تاثیر اور فکر آخرت پائی جاتی ہے، وہ کسی اور کی تحریر میں موجود نہیں ہے۔ میرا یہ دعوی ہے کہ جو شخص سنجیدگی کے ساتھ مولانا کی صحبت میں کچھ وقت گزارلے گا، اور مولانا کے اخلاق کریمانہ اور ان کے رہن سہن کا مشاہدہ کرلے گا، وہ اُن سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا (حبیب اللہ قاسمی، جھارکھنڈ، 20 جون 2008)۔

7- قابلِ احترام مولانا وحید الدین خاں صاحب السلام علیکم

سی پی ایس انٹرنیشنل کے ہفتہ وار اسپریچول کلاس میں شرکت کرنے کے بعد آج میں آپ کو پہلی دفعہ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ کلاس میں اِس ایک سالہ شرکت کے دوران میرا زبردست ذہنی ارتقاء ہوا ہے۔ میں نے آپ کتابیں بھی خوب پڑھیں تھیں اور میں الرسالہ مشن سے بھی صدفی صد اتفاق رکھتا تھا، لیکن جب حالات آتے تھے تو پھر میں ان کی رو میں بہہ جاتا تھا۔ اپنا ایمان ویقین کھو بیٹھتا تھا۔ مگر جب میں آپ کی کلاسز میں شریک ہونے لگا، تو میرے ایمان ویقین میں زبردست تبدیلی آگئی اور میرے اندر سے مادیت کا مزاج پوری طرح نکل گیا اور اب میں مطمئن زندگی گزارنے لگا ہوں۔

مولانا صاحب، میں آپ کی تربیت میں رہنے سے قبل آپ کی عظمت میں جیتا تھا، لیکن آپ سے ملنے، آپ کا مشاہدہ کرنے اور آپ کے ساتھ مسلسل وقت گزارنے کے بعد اب میں خدا کی عظمت میں جینے لگا ہوں۔ میرے دینی جذبات میں ترقی ہونے لگی ہے۔ ہر واقعہ پر مجھے خدا نظر آنے لگا ہے۔ بی ایڈ کے ایک سالہ کورس کے دوران میرے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شروع کے دنوں میں تو لگتا ہی نہیں تھا کہ میرا وقت گزرے گا، لیکن میں نے جب خدا کا دامن تھام لیا تو میرا وقت اس طرح گزر گیا کہ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ حسن اتفاق سے زندگی میں پہلی دفعہ مجھے اسم اعظم کے ساتھ دعا کرنے کا موقع اسی بی ایڈ کے زمانے میں ملا۔ خدا نے میری مدد ان جگہوں سے کی، جہاں میرا وہم وگمان بھی نہ گیا تھا۔ اب میں اپنے رب پر پختہ یقین کرنے لگا ہوں۔ اور پوری طرح مطمئن ہوں۔ جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے، ذہن میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ خدا مجھے کیسے بے یار ومددگار چھوڑ دے گا۔ میں اس کا بندہ ہوں، وہ میرا خدا ہے۔

مولانا محترم! میں نے آپ کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے تئیں جو تصورات قائم تھے، آپ اس سے بہت بلند نظر آئے۔ میں ہندستان کے بڑے بڑے مذہبی رہ نماؤں اور قائدینِ ملت سے ملا ہوں اور ان کی ذاتی زندگی میں جھانک کر بھی دیکھا ہے۔ مجھے آپ کے علاوہ، یہ لوگ تضاد بھری زندگی گذارتے ہوئے نظر آئے۔ ہر ایک کی پرسنل لائف اور اسٹیج کی لائف الگ الگ نظر آئی، جب کہ آپ کی دونوں لائف کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد دونوں کے درمیان مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ آپ وہی کرتے ہیں جو آپ کہتے ہیں۔ آپ کے کرنے اور کہنے میں کوئی فرق میں نے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ 4 اکتوبر 2007 کو میں نے اپنے والد صاحب کو خط لکھتے وقت آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تھا کہ ”مولانا وحید الدین خاں صاحب کے متعلق میں نے جو تصور اپنے ذہن میں بنایا تھا، مولانا صاحب اس سے کہیں زیادہ بلند نظر آئے۔ جو مولانا سے ملتا ہے، وہ خوش ہو جاتا ہے۔ ان کی مجلس میں لوگوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میں مولانا سے بہت قریب ہوں۔ مولانا ہر ایک سے یکساں انداز میں ملتے ہیں۔ بڑے سے بھی وہ اسی انداز میں ملتے ہیں جس طرح چھوٹے سے ملتے ہیں“۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ آپ، صرف اور صرف اسلام کی بات پیش کرتے ہیں، جب کہ بقیہ لوگ اسلام کی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں خدا کا چرچا کرنے سے کسی کو خوشی نہیں ہوتی ہے۔ جو لوگ خدا کے چرچے سے خوش نہ ہوں، وہ خدا کے بندے نہیں، وہ خدا کے مجرم ہیں۔ کاش وہ لوگ بھی اس بات پر غور کرتے جو سطحی لیڈری کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔

مولانا محترم! میں نے اسلام کو پہلے وراثت میں پایا تھا، آپ کی کتابوں کو پڑھ کر میں نے اسلام کو شعور کی سطح پر دریافت کیا ہے۔ بلاشبہہ مولانا صاحب، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اسلام کو جس طرح اس کی روح کی بلند سطح سے پایا، وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اسلام کو نہ پانے کی وجہ سے کچھ لوگ آپ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر وہ کامیاب ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے، جس طرح آپ ہر سطح پر کامیابی سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔ آپ نے جو سچائی خود دریافت کی تھی، اس سے دنیا والوں کو آگاہ کر دیا۔ بخدا، میں اِس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ اے داعیٔ حق، تو نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا۔ خدا آپ کو ضرور اجرِ عظیم عنایت کرے گا۔ میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ میں نے جس ربانی مشن کو شعور کی سطح پر دریافت کیا ہے، اس پر خدا مجھے ثابت قدم رکھے (آمین)۔

نئی دہلی، 26 جون، 2008 (شاہ عمران حسن، مونگیر، بہار)

8- Please let me present myself. My name is Maya Safira Muchtar, an indegenious Moslem from Indonesia (in Indonesia, Maya can also be a name for Moslems). It is my very honor to be in contact with you. I am a great admirer of your work. I was actually brought up in New Delhi during my childhood unto my teenage life. My father was the Regional Director for South East Asia of World Health Organization based in New Delhi. It is to my deepest regret that I have only discovered about you in my adult life when I have returned to Indonesia. I happened to be in Delhi last month and was in

your neighborhood to pay my respect to the Tomb of Hazrat Inayat Khan. However, I could not find your address in such a short time for we were supposed to catch the plane. My reason for writing is that I would like to ask your permission for us to be able to translate your work on Non-Violence and Islam (the paper was presented at the Symposium on Islam and Peace sponsored by Non-Violence International and The Mohammed Said Farsi Chair of Islamic Peace at the American University Washington D.C.) in Bahasa Indonesia. We would like to share your writings with our brothers and sisters in Indonesia. (27 June, 2008)

9- I got the DVDs and book from Maulana Wahiduddim Khan yesterday, and it's very great! I really appreciate his sight about Islam and peace mash'Allah! Muslim's world really need it! I will try to translate in French step by step the book you sending to me. I can’t promise to do it in a short time, but I will try to do it insh'Allah. By the way I almost finish to make the correction of the French booklets. (M. Daud, David Boussion, Philippines) June 22, 2008